آئینۂ ادب

AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر

ek/;fed f'k{kk cksMZ jktLFkku] vtesj

آئینۂ ادب

AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت

FOR CLASS XII

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر

ek/;fed f'k{kk ckM] jktLFkku] vtej

آئینۂ ادب

AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت

FOR CLASS XII

مرتّبین

ڈاکٹر فیروز بیگ (کنوینر)

Dr. Firoz Baig
Associate Professor (Convener)
Deptt. of Urdu
S.P.C. Govt. College, Ajmer

ڈاکٹر قائد علی خاں

Dr. Qaid Ali Khan
Associate Professor
Deptt. of Urdu
S.P.C. Govt. College, Ajmer

ڈاکٹر معین الدین شاہیؔن

Dr. Moinuddin 'Shaheen'
Associate Professor
P.G. Deptt. of Urdu
Govt. Dungar College, Bikaner

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

Dr. Shahidul Haque Chishty
(Principal)
Govt. Adarsh Higher Secondary School
Gagwana (Ajmer)

ہیرا لال

Hira Lal
(Lecturer Urdu)
Govt. Adarsh Sr. Sec. School, Mohangarh,
Jaisalmer

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر

ek/;fed f'k{kk ckM] jktLFkku] vtej

کمیٹی برائے اردو نصاب

۱۔ ڈاکٹر معین الدین شاہین (کنوینر)
گورنمنٹ ڈونگر کالج، بیکانیر

۲۔ ڈاکٹر شاہد الحق چشتی
گورنمنٹ آدرش ہائر سیکنڈری اسکول، گگوانہ (اجمیر)

۳۔ محمد صادق
گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول، رام سر (اجمیر)

۴۔ ڈاکٹر صولت علی خاں
ایس۔ پی۔ سی۔ گورنمنٹ کالج، اجمیر

۵۔ ڈاکٹر خورشید جہاں نقوی
یونی ورسٹی آف راجستھان، جے پور

کمیٹی برائے ترتیبِ درسی کتاب

AAINA-E-ADAB آئینۂ ادب : کتاب

برائے بارہویں جماعت

FOR CLASS XII

کنوینر

ڈاکٹر فیروز بیگ

Dr. Firoz Baig

Associate Professor (Convener)

Deptt. of Urdu, S.P.C. Govt. College, Ajmer

اراکین

ڈاکٹر قائد علی خاں

Dr. Qaid Ali Khan

Associate Professor

Deptt. of Urdu, S.P.C. Govt. College, Ajmer

ڈاکٹر معین الدین شاہین

Dr. Moinuddin 'Shaheen'

Associate Professor

P.G. Deptt. of Urdu

Govt. Dungar College, Bikaner

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

Dr. Shahidul Haque Chishty

(Principal)

Govt. Adarsh Higher Secondary School, Gagwana (Ajmer)

ہیرالال

Hira Lal

(Lecturer Urdu)

Govt. Adarsh Sr. Sec. School, Mohangarh, Jaisalmer

عہد (ifrKk)

بھارت میرا دیش ہے۔سبھی بھارتی میرے بھائی بہن ہیں۔میں اپنے دیش سے محبت کرتا/کرتی ہوں۔ مجھے اس کے کثیراور گونا گوں سرمایے پرفخر ہے۔میں اس کے لائق ہونے کے لیے ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا/کرتی رہوں گی۔

میں اپنے والدین، استاتذہ اور سبھی بزرگوں کی عزّت کروں گا/کروں گی۔اور ہر شخص کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آؤں گا/آؤں گی۔

میں اپنے دیش اور دیش کے باشندوں کے تئیں وفادار رہنے کا عہد کرتا/کرتی ہوں۔

میری خوشی صرف ان کی خوشحالی اور بہبودی میں ہی ہے۔

دولفظ

طالبِ علم کے لیے درسی کتاب منظّم مطالعے اور مبصّرانہ صلاحیت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔مواد اور طریقۂ تعلیم کی رو سے درسی کتاب کے معیار کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ درسی کُتب کو دقیق (مشکل) اور محض مدح و قدح کی مثال نہیں بنانا چاہیے۔ درسی کتاب آج بھی درس و تدریس اور طریقۂ تعلیم کا ضروری اور اہم ذریعہ ہے۔ جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

گذشتہ کچھ برسوں سے مادھیمک شکشا بورڈ، راجستھان کے نصاب میں لسّانی اور تہذیبی اقدار کی نمائندگی کی کمی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی۔تاہم صوبائی حکومت نے نویں جماعت سے بارہویں جماعت تک کے طلبا و طالبات کے لیے بذریعہ مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان، اپنا نصاب مرتب کر کے نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اسی کے مطابق بورڈ نے درسی کتب، تسلیم شدہ نصاب کے مطابق تیار کرائی ہیں۔امید ہے کہ یہ کتب طلبا و طالبات میں فکر و تدبّر اور اظہارِ خیال کی صلاحیت کے روشن مواقع فراہم کریں گی۔

پروفیسر بی۔ایل۔چودھری

صدر

مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان اجمیر

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ''آئینۂ ادب'' بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان ، اجمیر کی بارہویں جماعت کے لیے، تسلیم شدہ اردو نصاب کے مطابق مرتّب کی گئی ہے۔اس کتاب کو مرتّب کرتے وقت اُن تمام ضروری نکات اور اُمور کو ملحوظ رکھا گیا ہے جن کا تعلق تعلیم اور طالبِ علم سے ہوتا ہے۔کتاب میں ایسے اسباق اور تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے جن میں ہندوستانی تہذیب ،تمدّن اور صالح اقدار کی جھلک دکھائی دے۔قومی یکجہتی کے جذبے کو تقویت دینے کی غرض سے اردو کے مسلم اور غیر مسلم شعرا و ادبا کی تخلیقات کو یکساں طور پر شامل کتاب کیا گیا ہے۔طلبا کے معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے مشکل الفاظ اور بوجھل تحریروں سے حتّی الامکان گریز کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اسباق و تخلیقات کے ذریعہ طلبا میں وُسعتِ مطالعہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اسباق و تخلیقات میں تنوّع ،توازن اور اعتدال قائم کرنے کی غرض سے موضوعات کی تکرار سے گریز و پرہیز کیا گیا ہے۔ہر تخلیق اور مضمون کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی تحریر کیے گیے ہیں تا کہ طلبا کو معنی کی تلاش میں دقّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔

تمام اسباق کے آخر میں بالترتیب مختصر ترین، مختصر اور تفصیلی سوالات شامل کیے گئے ہیں تا کہ طلبا کو بورڈ کے امتحان کے ساتھ ساتھ مقابلوں کے امتحانات کے لیے بھی شعوری طور پر تیّار کیا جا سکے۔تخلیق اور تخلیق کار کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تا کہ طلبا کو سبق اور مصنف و شاعر سے متعلق اہم معلومات فراہم ہو سکیں۔شاملِ نصاب ادبی اصناف کا تعارف اور روایت کی تفصیل اس غرض سے پیش کی گئی ہے کہ

طلبا کو یہ علم ہو سکے کہ کس صنف کی کیا خصوصیات اور تقاضے ہیں۔ خواتین اور صوبۂ راجستھان کی نمائندگی کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ قواعد اردو سے متعلق معلومات بھی شاملِ کتاب ہیں۔ صحتِ متن اور طباعت کا حتّی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ زیرِ نظر نصابی انتخاب طلبا کی تعلیم و تربیت میں معاون ثابت ہوگا۔

مُرتّبین

اردوادب

Distribution of Marks

وقت: 3.15 کل نمبر:80

نمبر شمار	موضوع	نمبر
۱	خلاصۂ مضمون و نظم	10
۲	مضمون نگاری، قواعد	17
۳	نصابی کتاب: آئینۂ ادب	
	(الف) حصۂ نثر	25
	(ب) حصۂ نظم	28

۱۔	خلاصۂ مضمون و نظم	10
۲۔	تصنیف	17
	(الف) مضمون نگاری (سماجی وادبی موضوعات پر ایک مضمون)	08
	(ب) قواعد: علمِ بیان و بدیع: تشبیہہ، تلمیح، استعارہ، ایہام، حسنِ تعلیل، مراعات النظیر (چار میں سے تین صنعتوں کی تعریف مع مثال)	09
۳۔	حصۂ نثر	25
	(الف) اقتباسات کی تشریح اور ان پر مشتمل مختصر سوالات	08

(ب) شاملِ نصاب مضامین میں سے مختصر سوالات (چار میں سے تین) 06

(ج) ایک تفصیلی سوال (دو میں سے ایک) 5

(د) سوانح حیات: نصاب میں شامل کسی ایک مصنف کی سوانح حیات
اور طرزِ تحریر پر تبصرہ۔ 06

۴۔ حصہ نظم: 28

(الف) شامل نصاب منظومات میں سے دو اجزائے نظم کی تشریح (تین میں سے دو) 08

(ب) شاملِ نصاب منظومات/غزلیات پر مشتمل تفصیلی سوال (دو میں سے ایک) 06

(ج) شاملِ نصاب شعرا میں سے کسی ایک کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ اور
اس کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ۔ 06

(د) شاملِ نصاب منظومات میں سے چار مختصر سوالات (پانچ میں سے چار) 08

مجوزہ کتابِ نصاب: آئینۂ ادب

(راجستھان پاٹھیہ پستک منڈل، جے پور سے طبع شدہ)

اردو ادب (نصاب)

نصابی کتاب: آئینۂ ادب

حصۂ نثر

۱۔ داستان: تعریف اور مختصر تاریخ — ڈاکٹر فیروز بیگ

میر امّن: سیر پہلے درویش کی (میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملکِ یمن ہے)

۲۔ ناول: تعریف اور مختصر تاریخ — ڈاکٹر فیروز بیگ

ڈپٹی نذیر احمد: مرزا ظاہر دار بیگ

۳۔ مختصر افسانہ: تعریف اور مختصر تاریخ — ڈاکٹر قائد علی خاں

(i) منشی پریم چند: قول کا پاس

(ii) سریندر پرکاش: بجوکا

۴۔ مکتوب نگاری: ایک تعارف — ڈاکٹر معین الدین شاہیؔن

مرزا غالبؔ:

(i) بنام میاں داد خاں سیّاح (منشی صاحب سعادت و اقبال...)

(ii) بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ (بندہ پرور بہت دن کے بعد...)

۵۔ مضمون و انشا پردازی: ایک تعارف — ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

(i) ابوالکلام آزاد: حقیقی عظمت

(ii) وحیدالدین سلیمؔ: خطاب بہ طلبا

۶۔ طنز و مزاح: ایک تعارف — ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

پطرس بخاری: سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

۷۔ قواعد: علمِ بیان و بدیع — ہیرالال

۸۔ لسانیات: (سریع مطالعہ)

(i) اردو زبان کی پیدائش: مختلف نظریات — ڈاکٹر فیروز بیگ

(ii) دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ — ڈاکٹر قائدعلی خاں

(iii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات — ڈاکٹر قائدعلی خاں

(iv) علی گڑھ تحریک — ڈاکٹر فیروز بیگ

حصۂ نظم

غزل: ایک تعارف — ڈاکٹر شاہدالحق چشتی

غزلیات:

(الف) مرزا غالب:

(i) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

(ii) کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر

(ب) مومن خاں مومنؔ:

(i) اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا

(ii) ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

(ج) داغؔ دہلوی:

(i) جلوے میری نگاہ میں کون ومکاں کے ہیں

(ii) غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا

(د) جگرؔ مرادآبادی:

(i) دل کوسکون روح کوآرام آ گیا

(ii) برابر سے بچ کر گزر جانے والے

(ہ) فراقؔ گورکھپوری:

(i) آنکھوں میں جو بات ہوگئی ہے

(ii) ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے

قصیدہ: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

(i) مرزا محمد رفیع سوداؔ : (اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل)

(ii) شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: (ساون میں دیا پھر مہ شوّال دکھائی)

مرثیہ: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر قائد علی خاں

(i) میر انیسؔ:

امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی: فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے (انتخاب)

(ii) خواجہ الطاف حسین حالیؔ (مرثیۂ غالبؔ: بلبلِ ہند مرگیا ہیہات)

نظم: ایک تعارف ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

(i) نظیرؔ اکبرآبادی: روضۂ تاج گنج

(ii) خواجہ الطاف حسین حالؔی: جدید ترقیات

(iii) علاّمہ اقبالؔ: شعاعِ اُمّید

(iv) برج نرائن چکبست: رامائن کا ایک سین (انتخاب)

(v) قابلؔ اجمیری: بہ یادِ اجمیر

معاون کتب:

۱۔ تاریخِ ادب اردو: از پروفیسر سید نورالحسن نقوی
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۲۔ اردو قواعد: این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔نئی دہلی

فہرست

حصّہ ٔ نثر

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار/ مصنف/ مرتب	صفحہ نمبر
☆	دو لفظ	پروفیسر بی۔ ایل۔ چودھری	iv
☆	پیشِ لفظ	مرتّبین	v
۱	داستان: تعریف اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر فیروز بیگ	2
۲	میر امّن		6
۳	سیر پہلے درویش کی	میر امّن دہلوی	8
۴	ناول: تعریف اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر فیروز بیگ	15
۵	مرزا ظاہر دار بیگ	ڈپٹی نذیر احمد	20
۶	مختصر افسانہ: تعریف اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر قائد علی خاں	36
۷	قول کا پاس	منشی پریم چند	40
۸	بجوکا	سریندر پرکاش	47
۹	مکتوب نگاری: ایک تعارف	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	59
۱۰	خط بنام میاں داد خاں سیّاح	مرزا غالبؔ	63
۱۱	خط بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ	مرزا غالبؔ	68
۱۲	مضمون و انشا پردازی: ایک تعارف	ڈاکٹر شاہد الحق چشتی	74
۱۳	حقیقی عظمت	مولانا ابوالکلام آزادؔ	77

۱۴	خطاب بہ طلبا	وحیدالدین سلیمؔ	86
۱۵	طنز ومزاح: ایک تعارف	ڈاکٹر معین الدین شاہیؔن	98
۱۶	سویرے جو کل آنکھ میری کھلی	پطرس بخاری	102
۱۷	قواعد: علمِ بیان وبدیع	ہیرالال	118

حصّہ نظم

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار/ شاعر	صفحہ نمبر
۱	غزل: ایک تعارف	ڈاکٹر شاہدالحق چشتی	123
۲	مرزا غالبؔ:		127
	۱۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت......	مرزا غالبؔ	130
	۲۔ کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار......	مرزا غالبؔ	131
۳	مومن خاں مومؔن:		135
	۱۔ اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا	مومن خاں مومؔن	137
	۲۔ ٹھانی تھی دل میں........	مومن خاں مومؔن	138
۴	داغؔ دہلوی:		141
	۱۔ جلوے مری نگاہ میں....	داغؔ دہلوی	144
	۲۔ غضب کیا تیرے وعدے پہ....	داغؔ دہلوی	145
۵	جگؔر مرادآبادی:		148
	۱۔ دل کو سکون روح کو..........	جگؔر مرادآبادی	150
	۲۔ برابر سے بچ کر	جگؔر مرادآبادی	151

۶	فراقؔ گورکھپوری:		154
	ا۔آنکھوں میں جو بات......	فراقؔ گورکھپوری	157
	۲۔ ہر کائنات سے یہ......	فراقؔ گورکھپوری	158
۷	قصیدہ:تعریف اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	161
۸	مرزا محمد رفیع سوداؔ:		164
	اٹھ گیا بہمن ودے کا.....(انتخاب)	مرزا محمد رفیع سوداؔ	166
۹	محمد ابراہیم ذوقؔ:		176
	ساون میں دیا پھر مہِ شوّال..(انتخاب)	محمد ابراہیم ذوقؔ	178
۱۰	مرثیہ:تعریف و تاریخ	ڈاکٹر قائد علی خاں	185
۱۱	میر انیسؔ:		188
	امام حسینؓ کی مدینے سے روانگی(انتخاب)	میر انیسؔ	191
۱۲	خواجہ الطاف حسین حالیؔ:		200
	مرثیۂ غالبؔ(انتخاب)	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	203
۱۳	نظم: ایک تعارف	ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ	209
۱۴	نظیرؔ اکبر آبادی:		212
	روضۂ تاج گنج	نظیرؔ اکبر آبادی	214
۱۵	خواجہ الطاف حسین حالیؔ:		221
	جدید ترقیات	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	223
۱۶	علّامہ اقبالؔ:		229
	شُعاعِ اُمید	علّامہ اقبالؔ	231

۱۷	برج نرائن چکبست :		238
	رامائن کا ایک سین (انتخاب)	برج نرائن چکبست	240
۱۸	قابلؔ اجمیری:		248
	بہ یادِ اجمیر	قابلؔ اجمیری	251

سریع مطالعہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار/مصنف/مرتب	صفحہ نمبر
۱	اردو زبان کی پیدائش: مختلف نظریات	ڈاکٹر فیروز بیگ	257
۲	دبستانِ دہلی	ڈاکٹر قائد علی خاں	261
۳	دبستانِ لکھنؤ	ڈاکٹر قائد علی خاں	265
۴	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر قائد علی خاں	268
۵	علی گڑھ تحریک	ڈاکٹر فیروز بیگ	273

حصّہ ٔ نثر

ڈاکٹر فیروز بیگ

داستان: تعریف اور مختصر تاریخ

داستان نثری ادب کی قدیم اور مقبول صنف ہے۔ قصّہ، کہانی کو ایک صنف کی حیثیت سے داستان ہی نے متعارف کیا۔ اگر چہ ابتداً داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ بعد میں تحریری شکل میں منظرِ عام پر آئیں۔ فطرتِ انسانی ہے کہ قصّہ، کہانی کہنا اور سننا اس کا محبوب مشغلہ رہا۔ داستانیں اُس وقت وجود میں آئیں جب لوگوں کے پاس فرصت اور فراغت تھی۔ اس لیے داستانیں وقت گزاری کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔

داستان ایک طویل اور مسلسل قصے کو کہتے ہیں، جس کی بنیاد حقیقت پر نہیں ہوتی بلکہ فرضی وخیالی چیزیں اور مافوق الفطرت عناصر پر ہوتی ہے۔ جس کا مقصد تفریحِ طبع اور تفکرات سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جب انسانی شعور ترقی یافتہ نہ تھا اُس وقت یہ داستانیں انسان کی آرزوؤں، امنگوں اور جذبات کی تسکین کرتی تھیں، وہ چیزیں جو اسے حقیقی زندگی میں حاصل نہیں ہوتی تھیں وہ اسے خوابوں کی دنیا میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

داستان کے فن پر نظر ڈالیں تو پلاٹ، کردار، مکالمہ، مافوق الفطرت عناصر، تخیل ومبالغہ اور انجام یہ داستان کے لازمی اجزا ہیں جس کے بغیر داستان مکمل نہیں ہوتی۔

داستان کے اجزا مندرجہ ذیل ہیں:-

پلاٹ:

پلاٹ واقعات کی ترتیب وتنظیم کو کہتے ہیں، جو داستانوں میں اکثر مفقود ہے۔ داستانوں کے پلاٹ عموماً مربوط ومسلسل نہیں ہوتے۔ ایک قصہ میں دوسرا قصہ پیوست ہوتا ہے، مرکزی قصے میں ضمنی قصے

جوڑ دیے جاتے ہیں جو اس کی طوالت میں اضافہ کرتے ہیں، دلچسپی اس کا بنیادی عنصر ہے، داستانیں زیادہ تر عشقیہ موضوعات پر لکھی جاتی تھیں۔

کردار:

داستانوں میں کردار حقیقی زندگی کے کرداروں سے بالکل مختلف غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک، بادشاہ، وزیر، شہزادہ، شہزادیاں، نجومی، رمّال، جن، دیو، پری ہوتے ہیں، شہزادہ اپنی منزلِ مقصود کو حاصل کرنے کے لئے فوق الفطری عناصر سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اپنی محبت کو حاصل کر لیتا ہے۔

مافوق الفطرت عناصر:

فوق الفطری عناصر داستانوں کا لازمی جزو ہے، یعنی جن، دیو، پری، ہوا میں پرواز کرتے ہوئے قالین، بولتے ہوئے جانور، جادو کی ٹوپی، عجیب الخلقت لوگ اگر ان کو داستانوں سے نکال دیا جائے تو داستان، داستان نہ رہے۔

تخیل ومبالغہ:

تخیل اور مبالغہ پر داستان کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ داستانیں خیالی وفرضی واقعات پر استوار ہوتی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا سارے واقعات حیرت واستعجاب میں ڈالنے والے ہوتے ہیں۔

انجام:

داستانوں کا انجام ہمیشہ نشاطیہ اور رجائی ہوتا ہے، یہاں انسان کی کبھی شکست نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کرتا ہے۔ داستانوں میں زندگی کا راز مایوسی پر نہیں امید پر قائم ہے۔ داستانوں میں حق اور باطل کا ٹکراؤ اور باطل پر حق کی فتح دکھائی جاتی ہے۔ داستانوں میں زبان وبیان کی رنگینی عبارت آرائی اور لطافت کا ہونا ضروری ہے۔

داستان کی تاریخ

اردو میں داستانیں نظم ونثر دونوں میں لکھی گئیں۔اردو میں منظوم داستانوں کا سلسلہ۱۴۳۵ء سے ملتا ہے۔فخر دین نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کو پہلی منظوم داستان کہا جاتا ہے۔اور نثر میں ملا وجہی کی 'سب رس' کو جو۱۶۳۵ء میں لکھی گئی،اردو نثر کی پہلی داستان کہا جاتا ہے۔دکن میں 'سب رس' کے علاوہ منشی محمد ابراہیم بیجاپوری نے فارسی 'انوارِ سہیلی' کا ترجمہ دکنی 'انوارِ سہیلی' کے نام سے کیا۔شمس الدین احمد نے 'الف لیلیٰ' کا پہلا اردو ترجمہ 'حکایت الجلیلہ' کے نام سے کیا۔اس کے علاوہ دکنی 'سنگھاسن بتیسی' اور 'ملکۂ زماں وکام کندلہ' اہم داستانیں ہیں۔

شمالی ہند میں اٹھارویں صدی سے قبل کوئی داستان نہیں ملتی ،اٹھارویں صدی میں شمالی ہند کی داستانوں میں عیسوی خاں کی 'قصۂ مہرافروز ودلبر'،عطا حسین خاں تحسینؔ کی 'نوطرزِ مرصّع'،مہر چند کھتری کی ،'نوآئینِ ہندی' 'عرف قصہ ملک محمد وگیتی افروز'،سید حسین شاہ حقیقت کی 'جذبِ عشق'،مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کی 'عجائب القصص' بھی اہم داستانیں ہیں۔

اردو داستان کو فروغ دینے میں فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی داستانوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان میں میرامن کی 'باغ و بہار'،حیدر بخش حیدری کی 'آرائشِ محفل' اور 'طوطا کہانی'، شیر علی افسوس کی 'باغِ اردو' مرزا علی لطفؔ کی 'تذکرۂ گلشنِ ہند'،بہادر علی حسینی کی 'نثرِ بےنظیر'،'اخلاقِ ہندی'،مظہر علی ولاؔ کی 'مادھونل اور کام کندلہ' 'ہفت گلشن'، مرزا کاظم علی جواںؔ کی 'شکنتلا'،نہال چند لاہوری کی 'مذہبِ عشق'، قابلِ ذکر ہیں۔اسی دور میں فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی داستانیں لکھی گئیں ان میں انشا اللہ خاں انشاؔ کی

'رانی کیتکی کی کہانی'، رجب علی بیگ سرورؔ کی 'فسانۂ عجائب' اہم ہیں۔'فسانۂ عجائب' شمالی ہند کی پہلی اہم طبع زاد داستان ہے۔

غرض 'داستان امیر حمزہ'، 'بوستانِ خیال'، 'آرائشِ محفل'، 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'الف لیلیٰ'، 'رانی کیتکی کی کہانی' وغیرہ اردو کی مشہور داستانیں ہیں۔

میر امّن

میر امّن کا نام میر امان علی تھا اور امّن تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۵۰ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ مغل بادشاہ عالم گیر شاہ ثانی کے عہدِ حکومت تک دربارِ شاہی سے وابستہ رہے، اور خانہ زاد موروثی و منصب دار قدیمی کہلائے۔ ۱۷۶۱ میں احمد شاہ ابدالی کے حملے نے دلی شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور سورج مل جاٹ نے ان کی آبائی جا گیر پر قبضہ کر لیا، تو میر امّن دہلی کو خیر باد کہہ کر عظیم آباد (پٹنہ) چلے آئے۔ کچھ عرصہ یہاں رہے مگر روزگار کی کوئی صورت نہ بنی۔ آخر کار کلکتہ پہنچے۔ کچھ وقت بے روزگاری میں گزارا۔ آخر منشی میر بہادر علی حسینی کے ذریعہ جان گل کرسٹ سے رسائی ہوئی اور فورٹ ولیم کالج میں منشی کی حیثیت سے ملازمت حاصل کی۔

میر امّن نے فورٹ ولیم کالج کے اُردو زبان کے شعبے کے صدر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر انگریز افسروں کو اُردو سکھانے کے لیے فارسی قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ''باغ و بہار'' کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمہ میں انھوں نے ٹھیٹھ ہندوستانی زبان کا استعمال کیا ہے اور دِلّی کی بول چال کی زبان اور محاورے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں۔ میر امّن نے لکھا ہے کہ ''باغ و بہار'' کی زبان وہی ہے جو دہلی کے بچے، بوڑھے، مرد، عورت اور ہندو مسلمان بولتے ہیں۔ میر امّن سے پہلے میر عطا حسین خان تحسین بھی ''نوطرزِ مرصّع'' کے نام سے اس قصے کا ترجمہ کر چکے تھے۔ لیکن اس کی زبان بہت مشکل تھی لیکن میر امّن نے اس قصہ میں نہایت آسان، صاف اور بول چال کی

زبان استعمال کی۔

باغ و بہار میں چار درویشوں کے قصے بڑے پُر لطف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل قصہ ''سیر پہلے درویش کی'' میں بھائی اور بہن کا قصہ ہے۔ میر امّن نے بہن کا ایسا صحیح اور موثر تصور پیش کیا ہے کہ ہمارے پورے داستانی ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ باغ و بہار میں ہر قسم کے فوق فطری عناصر موجود ہیں۔ دیو، پری، بلائیں، جادوگر اور عجیب الخلقت کا ذکر ہے۔ میر امّن کی زبان سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ بھی نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ باغ و بہار میں اُس زمانے کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس میں اخلاقی رنگ بھی ہے اور حسن و عشق کی رنگینیاں بھی۔ اس میں اچھی داستان کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ میر امّن نے ایک اور فارسی کتاب ملّا حسین واعظ کاشفی کی ''اخلاقِ محسنی'' کا ''گنجِ خوبی'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں میر امّن کا انتقال ہوا۔

میر امّن دہلوی

سیر پہلے درویش کی

میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجّار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی۔ ان کے یہاں دولڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی میلی پہنے ہوئے مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن جس کی قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچّے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسبِ فن، سوداگری کا بہی کھاتہ، روز نامچہ سکھینے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بےفکری میں گزرے۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دِل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہیٰ سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں کرسکتا۔ ایک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دِن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دِن جوں توں کر کٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا۔ دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو، اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہشیار رہو۔ تسلّی دے کر وہ رخصت ہوئے۔ گماشتے کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے کوٹھے نقد و جنس کی اپنی نظرِ مبارک سے دیکھ لیجئے۔ ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ

پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کا حکم کیا۔فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے، چلونیں تکلف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمت گار، دیدہ رونوکرر کھے۔سرکار سے زرق برق کی پوشا کیں بنوا دیں۔فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹے خوشامدی آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے، اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں، واہی تباہی ادھر اُدھر کی کرتے اور کہتے ''اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گل گلاب کھنچوائیے نازنین معشوقوں کو بلوا کر ان کے ساتھ پیجئے اور عیش کیجئے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے! ہردم کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔شراب ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا، گویا لُوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کدھر جاتا ہے۔ مالِ مُفت دلِ بے رحم۔اس درخرچی کے آگے اگر گنجِ قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں نثار کرتے تھے کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے ڈھیلت، خاص بردار، ثابت خانی سب چھوڑ کر کنارے لگے۔کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا، جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا۔سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑا کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔لاچار بے حیائی کا برقعہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا بہن کے پاس چلیے۔لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا۔نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے ان کا بھی جواب اس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا،

پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پا پیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیر کے شہر میں جا کر اُس کے مکان پر پہنچا۔

وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی تیل، ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی اگر چہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا، لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟ اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس، بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا، سوہن پستہ، مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے، خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے، کباب تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجالایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پانوٴں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی۔ ”اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اُس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولت دنیا کھو، کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑی کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔

یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا ”اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو،

جو کہو سو کروں‘‘ یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے، پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی ’’ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے، دست آویز پکی لکھوالو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجو یا آپ بیچیو۔‘‘ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر، ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت و خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کے راستے چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سرے پاو بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی ’’سدھارو! تمہیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو، میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا، ’’تمہارا بھی اللہ حافظ ہے، میں نے قبول کیا۔‘‘ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
مہاجن	دولت مند،سوداگر،ساہوکار
گماشتہ	وہ شخص جسے کوئی کام سپرد کیا گیا ہو،کارندہ،منیم،وکیل
مرشد	ہدایت کرنے والا،رہ نُما،پیر،اُستاد
قبلہ گاہ	والد ماجد،بزرگ
سپاہ گری	سپاہی کا کام یا پیشہ
روزنامچہ	ہر روز حساب لکھنے کی کتاب،ڈائری
اندیشہ	فکر،سوچ،خوف
چہلم	چالیسواں،چالیسویں کا فاتحہ
آن	قسم،عہد،سوگند،بڑوں کی رسم کے خلاف
نذر	کسی بڑے کے سامنے کوئی چیز بطور تحفہ پیش کرنا
لگّا	لاگ،پیار،دوستی،نسبت،برابری،ہمسری،ڈھنگ،شروع
زرق برق	شان وشوکت والا
خوشامدی	جھوٹی تعریفیں کرنے والا۔
آشنا	واقف کار،جان پہچان والا
مُصاحِب	ساتھی،ہم نشین،خاص دوست
صحبت	ساتھ،دوستی،ہمراہی،مجلس،مل بیٹھنا

ژٹلیں	بکواس، بے معنی بات، فضول قصّہ
عالم	زمانہ، دُنیا، مخلوق، قسم، جنس، حالت صورت، ڈھنگ
مِزاج	طبیعت، خاصیّت، عادت
رقِیب	معشوق کے عاشقوں میں سے کوئی ایک
قارُون	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی جو بہت مالدار تھا۔
فقط	صرف، تنہا، اکیلا، بس، ختم
میّسر	وہ چیز جو آسانی سے مل سکے، حاصل، موجود
قصد	ارادہ، نیّت، مطلب، کوشش
اِشتیاق	شوق، آرزو، تمنّا
پاپیادہ	پیدل، سواری کے بغیر، پاؤں پاؤں
لوزیات	بادام کا حلوہ
تصدیع	دکھ، درد، تکلیف
فراغت	نجات، رہائی، اطمینان، آسودگی
خلوت	تنہائی کی جگہ، خواب گاہ
موئی مٹی	مرا ہوا، مردہ، نعش، میت
نوشت وخواند	تحریر، لکھائی، لکھنا پڑھنا
خشکی	سوکھا پن، نمی نہ ہونا، روکھا پن، زمین
تواضع	خاطر مدارت، مہماں نوازی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ''سیر پہلے درویش کی'' کس داستان کا قصہ ہے؟

۲۔ ''باغ و بہار'' کے مصنف کا کیا نام ہے؟

۳۔ مرشدوں کی حضوری میں کون حاضر رہتا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ پہلے درویش کو عجب طرح کا غم کیوں ہوا؟

۵۔ داستان 'باغ و بہار' کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

۶۔ بہن نے پہلے درویش کی خاطر داری کس طرح کی؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ داستان کسے کہتے ہیں؟ داستان کی تعریف اور اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔

۸۔ میر امّن کی حالاتِ زندگی تحریر کیجیے اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

ڈاکٹر فیروز بیگ

ناول: تعریف اور مختصر تاریخ

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''نیا'' کے ہیں۔ زندگی کی عکاسی کرنے والے مسلسل قصے یا کہانی کو ناول کہا جاتا ہے۔ یہ کہانی کی جدید صنف ہے جو داستان کے بعد منظر عام پر آئی۔ وقت کی ضرورت اور زمانہ کے حالات کے سبب ناول وجود پذیر ہوا۔ ناول میں داستان کے برعکس زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ناول سیاسی، سماجی، اخلاقی، اصلاحی، تاریخی سبھی موضوعات پر لکھے گئے جہاں تک فن اور تکنیک کا تعلق ہے ناول میں کہانی، پلاٹ کردار، مکالمے، پس منظر، زماں و مکاں، اسلوب، نقطۂ نظر، ضروری اجزاء ہیں جو کم و بیش سبھی ناولوں میں ملتے ہیں۔

ا۔ کہانی:

ناول کا بنیادی عنصر ہے، ناول میں کہانی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر افسانوی صنف چاہے وہ داستان ہو، ناول ہو، مختصر افسانہ ہو یا ڈرامہ سبھی میں کہانی اس کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ ناول میں حقیقی زندگی کی کہانی پیش کی جاتی ہے۔ قدیم زمانے سے ہی انسان قصے کہانیوں میں دلچسپی لیتا رہا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کے روپ بدلتے رہے۔ ہر کہانی میں ابتدا ہوتی ہے درمیانی حصّہ نقطۂ عروج ہوتا ہے پھر کہانی انجام پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی میں دلچسپی کا برقرار رہنا انتہائی ضروری ہے۔

۲۔ پلاٹ:

پلاٹ میں واقعات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ کہانی

میں مختلف واقعات ہوتے ہیں۔ایک واقعے کا دوسرے واقعے پر جواثر پڑتا ہےاس کونمایاں کیا جا تا ہے۔ پلاٹ دوطرح کے ہوتے ہیں ایک مربوط پلاٹ دوسرے غیر مربوط پلاٹ ۔مربوط پلاٹ میں غیر اہم واقعات اور کرداروں کو بڑے پیمانے پر پیش نہیں کیا جا تا بلکہ ضروری اوراہم واقعات وکرداروں کوفوقیت دی جاتی ہے ۔غیر مربوط پلاٹ وہ ہوتے ہیں جس میں بے شمار واقعات وکردار بے ترتیب انداز میں موجودرہتے ہیں۔

۳۔ کردار:

ناول میں حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے کردار ہوتے ہیں جوروزمرہ کی زندگی میں ہمیں نظرآتے ہیں،کردارہی کہانی کوآگے بڑھاتے ہیں۔ناول کے کرداروں کی خوبی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ ایسے جیتے جاگتے ہوں کہ ہم انھیں حقیقی انسان سمجھ لیں جیسے نذیراحمد کا ناول'مراۃ العروس' میں اصغری واکبری کا کردار،'توبتہ النصوح' میں مرزا ظاہردار بیگ کا کردار،مرزاہادی رسوا کے ناول'امراؤ جان ادا' میں امراؤ جان ادا کا کردارا تنے حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ ان پر فرضی وخیالی ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔کردار دو طرح کے ہوتے ہیں یک رخی(Flat)دوسرے پہلودار(Round) کردار جوکہانی کومکمل بناتے ہیں۔

۴۔ مکالمے:

کرداروں کے درمیان آپسی گفتگواور بات چیت کومکالمے کہتے ہیں،مکالمہ فطری اور کرداروں کے حسب مراتب ہونے چاہئیں۔کردار جس حیثیت اور طبقہ سے تعلق رکھتا ہےاسی کے مطابق مکالمے لکھے جاتے ہیں۔جیسے بادشاہ کے مکالموں سے اس کے شاہی مرتبہ اور غلام کے مکالموں سے عاجزی و انکساری ظاہر ہونی چاہیے۔اعلیٰ متوسط اورادنیٰ سبھی طبقے کے کردار کہانی کا حصہ ہوتے ہیں۔ناول نگار کو اچھے مکالمے لکھنے کے لیے زبان وبیان پرقدرت ہونا بہت ضروری ہے۔

۵۔ زماں ومکاں:

ناول میں کہانی کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر، ماحول اور زماں ومکاں کا اہم رول ہوتا ہے، کردار کس ماحول کا پروردہ ہے، قصہ میں پیش آنے والے واقعات کس مقام اور زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں غرض ناول نہ صرف اپنے دور کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اس دور کی تہذیب ومعاشرت، اخلاقی اقدار کی جھلک بھی ان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ چونکہ ناول حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے ان کا ماحول، پس منظر اور زماں ومکاں بھی اتنے ہی حقیقی ہوتے ہیں۔

٦۔ اسلوب:

ناول میں اسلوب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس پر ناول کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے، مصنف کا اسلوب بیان ہی اس کی پہچان بنتا ہے۔ ہر صنف ادب کا اسلوب منفرد ہوتا ہے، ناول میں واقعات کی ترتیب ہو یا کرداروں کا ارتقاء یا قصہ میں دلچسپی کا عنصر سب ناول نگار کے بہترین اسلوب نگارش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۷۔ نقطۂ نظر:

ناول نگار زندگی کے جس پہلو کو کرداروں کے ذریعہ قاری تک پہنچاتا ہے اس میں اس کا نقطۂ نظر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے جیسے نذیر احمد کی ناول میں ان کا اصلاحی نقطۂ نظر صاف نظر آتا ہے۔ امراؤ جان ادا کے قصے کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ انسان بذاتِ خود راہِ راست پر ہوتا ہے لیکن حالات وواقعات بھی اسے برے راستے پر لے جاتے ہیں۔

۸۔ ناول کا ارتقا:

اردو میں ناول نگاری کا آغاز نذیر احمد سے مانا جاتا ہے۔ ان کا ناول ''مراۃ العروس'' جو کہ

۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا گیا۔ نذیر احمد نے متوسط طبقہ کے مسلم گھرانوں کی معاشی اور اخلاقی زندگی پر غور کیا اور اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ 'مراۃ العروس'، 'بنات النعش'، 'توبتہ النصوح'، 'فسانۂ مبتلا'، 'ابن الوقت'، 'ایامی'، 'رویائے صادقہ' ان کے مشہور ناول ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول 'فسانۂ آزاد' ہے جس میں لکھنوی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ 'جامِ سرشار'، 'سیر کہسار'، 'کامنی'، 'کڑم دھڑم' ان کے نمائندہ ناول ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے کامیاب تاریخی ناول لکھے۔ فردوس بریں، منصور موہنا، ملک ورجینا ان کے مشہور ناول ہیں۔

مرزا ہادی رسوا کا نام ان کے شاہکار ناول امراؤ جان ادا کی وجہ سے ادبی حلقوں میں مشہور ہوا۔ یہ ایک بہترین ناول ہے جس میں نفسیاتی تجزیہ بھی موجود ہے اور لکھنوی تہذیب بھی، آپ نے ذات شریف، شریف زادہ، اختری بیگم، افشائے راز ناول بھی لکھے۔

پریم چند اردو کے مشہور اور کامیاب ناول نگار ہیں انہوں نے سماجی مسائل، دیہی زندگی اور حقیقت نگاری کو ناول میں جگہ دی، انہوں نے بہت سے ناول لکھے ان میں 'جلوۂ ایثار'، 'بازارِ حسن'، 'گوشۂ عافیت'، 'غبن'، 'نرملا'، 'پردۂ مجاز'، 'چوگان ہستی'، 'بیوہ'، 'میدانِ عمل'، 'گئودان' شامل ہیں۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا جس نے ادب کو زندگی سے قریب تر کیا۔ اردو ناول کو بعض نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ اس دور میں جو ناول لکھے گئے ان میں سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات' قاضی عبدالغفار کا 'لیلیٰ کے خطوط' عصمت چغتائی کا 'ٹیڑھی لکیر' قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا' کرشن چندر کا 'شکست' اور عزیز احمد کا 'گریز' قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر نے اپنی ناولوں میں اشتراکی خیالات کو پیش کیا وہیں عصمت چغتائی نے متوسط گھرانوں کے لڑکےلڑکیوں کے جنسی مسائل کو ناولوں کا موضوع بنایا، قرۃ العین حیدر کا مطالعہ بہت وسیع

تھا،انہوں نے نئ تکنیک شعور کی رو سے متعارف کرایا اور اسے اپنی ناولوں میں بخوبی برتا۔آگ کا دریا ان کا مشہور ناول ہے۔

تقسیم ملک کے بعد ان حالات کا عکس اس عہد کی تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔اس دور میں عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی' خدیجہ مستور کا 'آنگن' حیات اللہ انصاری کا 'لہو کے پھول' راجندر سنگھ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی'، بلونت سنگھ کا 'معمولی لڑکی' قاضی عبدالستار کا 'شب گزیدہ' مہندر ناتھ کا 'ارمانوں کی سیج' جمیلہ ہاشمی کا 'تلاش بہاراں' جیلانی بانوں کا 'ایوانِ غزل' انور سجّاد کا 'خوشیوں کا باغ' انتظار حسین کا 'بستی' سلیم اختر کا 'ضبط کی دیوار' جیسے ناول منظر عام پر آئے۔

ڈاکٹر فیروز بیگ

ڈپٹی نذیر احمد

مولوی نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا نذیر احمد نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور سے عربی، نجوم، منطق اور فلسفہ پڑھا۔ چودہ سال کی عمر تھی کہ والد ان کو دہلی لے آئے اور تعلیم کے لئے آپ کو مولوی عبدالخالق کے سپرد کیا۔ نذیر احمد نے طالب علمی کے زمانے میں استاد کا حکم بجالانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ مولوی صاحب کے گھر کا سودا سلف لانا، کھانے کی صورت نہ ہوتی تو گھر گھر سے کھانا مانگ کر لاتے۔ ان کی پوتی اپنے گھر اور سارے محلے کا مصالحہ باریک پسواتی تھی۔ مولوی صاحب نے ان کی لیاقت اور پڑھائی میں ان کی ترقی کو دیکھ کر اپنی پوتی کی شادی ان سے کردی۔ دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ انتہائی محنت و لگن سے پڑھائی پوری کی پھر مدرس کی حیثیت سے پنجاب میں تقرر رہوا۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس کانپور اور الہ آباد مقرر ہوئے۔ تعزیرات ہند کے ترجمے کا کام بھی کیا۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنے۔ سر سالار جنگ حیدر آباد نے ان کو حیدر آباد بلا لیا۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی صاحب دہلی چلے آئے اور باقی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ۱۸۹۷ء میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ آپ نے غیر شعوری طور پر ناول نگاری کی شروعات کی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم دینے کے لیے ایسے قصے چنے جو دلچسپ بھی ہوں اور نصیحت آموز بھی۔ نذیر احمد نے ناولوں میں حقیقی زندگی کی تصویر کشی کی ہے اور مسلم معاشرت کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کیے ہیں۔ نذیر احمد کا ہر ناول اصلاحی ہے اور کسی نہ کسی سماجی عیب کو دور کرنے کے خیال سے لکھا گیا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مقصدیت حاوی ہے۔ انہوں نے اپنے قصوں سے دینداری، خدا ترسی اور

اصلاحِ معاشرت کا کام لیا ہے۔ان کی نظرفن کے بجائے مقصد پر ہوتی ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ،خانہ داری ، پاکیزہ مذہبی فضا ،ان کے ذاتی تجربات ونظریات ہمیں ان کی ناولوں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ان ناولوں کے پلاٹ مربوط ہیں۔کردارنگاری میں انھیں مہارت حاصل ہے۔مکالے لاجواب ہیں۔

نذیراحمد کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔مراۃ العروس کے بعدانہوں نے ''بنات النعش '' لکھا یہ ناول ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔''توبتہ النصوح ''۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں ''فسانۂ مبتلا'' لکھا۔ابن الوقت ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد''ایامیٰ'' پھر۱۸۹۴ء میں''رویائے صادقہ'' شائع ہوا۔انہوں نے ان تمام ناولوں کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور خاص طور پر تعلیمِ نسواں کی اہمیت اورضرورت پر زور دیا۔توبتہ النصوح ایک مقصدی ناول ہے۔نذیراحمد نے ہر کردارکو بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔مرزاظاہردار بیگ توبتہ النصوح کا ایک زندہ اورفطری کردار ہے ظاہردار بیگ جیسے خود پسند،خوشامدی،ظاہردار،نمائش پرست کردار ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ظاہردار بیگ جواصلی زندگی میں دولت وثروت سے محروم رہا اپنی لفاظی اور جادو بیانی کے ذریعہ اپنی شان وشوکت کوقائم رکھنے میں مصروف تھا۔امیرزادوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا،امیروں جیسی عادتیں اختیار کرنا اوران ہی لوگوں کی طرح وضع قطع بنانا،مشاعروں اورنشستوں میں بلاتکلف جانا اورخودکو جمعدار کی اولاد ظاہر کرنا، کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے ہم اس پرلطف کردار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہوجاتے ہیں گرچہ یہ کردارمختصر عرصے کے لئے ہمارے سامنے آتا ہے مگراپنی چرب زبانی سے جھوٹ کوسچ بناکراس طرح پیش کرتا ہے کہ ہمیں اس کی غلط بیانی کا گمان تک نہیں ہوتا۔

نصاب میں شامل سبق مرزاظاہردار بیگ نذیراحمد کی ناول'' توبتہ النصوح'' کا کردار ہے جس میں انہوں نے مرزاظاہردار بیگ کا خاکہ کھینچا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

مرزا ظاہر دار بیگ

اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عمل داری سرکار میں جناب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کے رواداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جمع دار نے باوجودے کہ دور کی قرابت تھی۔ حبۃً لِلّٰہ اس کا تکفّل اپنے ذمّے لے لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر، اس کے بیٹے پوتے، نواسے کثرت سے تھے۔ انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اگر چہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دِقت محل سرا کے پہلو، میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کے کرائے کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات اس پر مرزا کی شیخی اور نمود یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار والوں کی برابری کرے، جن کو صد ہا روپے ماہوار کی آمدنی تھی اگر چہ جمعدار والے اس کو منھ نہیں لگاتے تھے، مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا یہ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان، کسی کو خالو جان بناتا، اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے، اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اَور زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نبھے تو کیسے؟ دکانیں گرِوی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہتیرا بکتی، مگر کون سنتا تھا؟ مرزا کو جب دیکھو، پانو میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی، سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو

انگرکھے،اوپرہلکی سی تن زیب، نیچے کوئی طرح دارڈھاکے کانینو، جاڑا ہوا تو بانات،مگرسات روپے گز سے کم کی نہیں، خیر، یہ تو صبح وشام،اورتیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی،جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کم خواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی،سرخ نیفہ، پائجامہ اگرڈھیلے پائنچوں کا ہواتو کلی داراوراس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دودوقدم آگے،اوراگرتنگ مُہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں،اوراوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا، ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوااوراس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھاغرض دیکھا تو مرزاصاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سربازارچھم چھم کرتے چلے جارہے ہیں۔

کلیم سے، اورمرزاسے محفل مشاعرہ میں تعارف ہوا شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے، یہاں تک کہ چندروز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویاایک جان دو قالب تھے۔کلیم کوتو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوامگرمرزا شام کوتو کبھی کبھی،لیکن صبح کو بلاناغہ آتے ،اورتمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے ،مرزانے اپنااصلی حال کلیم پرظاہرنہیں ہونے دیا،کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کوملاہےاوروہ جمعدار کے بیٹے پوتوں کومرزا کی محل سرااور جمعدار کے دیوان خانے کومرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کومرزا کے نوکرسمجھتا تھا،اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا،تو سیدھا جمعدار کے محل سرا کی دیوڑھی پر جاموجودہوا۔باربار کے پکارنے اورکنڈی کھڑکھڑانے سے دولونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اوران میں سے ایک نے پوچھا،

کون صاحب ہیں،اوراتنی رات گئے کیا کام ہے؟

کلیم۔جاؤمرزاکوبھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزاظاہردار بیگ،جن کا مکان ہے،اورکون مرزا؟

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہردار بیگ نہیں رہتا۔

اتنا کہہ کرقریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ جلدی سے کلیم نے کہا۔ کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں؟،،

لونڈی: ''ہے کیوں نہیں؟''

کلیم پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں، کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں؟

لونڈی جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے، موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے؟

دوسری لونڈی: ''اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگت زرد ہے، آنکھیں کرنجی، چھوٹا قد، دُبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رکھتے ہیں۔''

کلیم: ''ہاں ہاں، وہی ظاہر دار بیگ۔''

لونڈی: ،،تو میاں! اس مکان کے پچھواڑے، اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے، وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے اہا، آپ ہیں، معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں، بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں، میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔

کلیم؛ چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی پاس تک آیا تھا۔

مرزا: پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں؟

کلیم؛ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا: بسم اللہ تو چلیے، اسی مسجد میں تشریف رکھیے، بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجدِ ضرار کی طرح وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزار ہا چمگاڈریں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھڑنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب بہ طور دفع دخلِ مقدر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ، اختلاجِ قلب کا روگ ہے، اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا، اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا

مرزا: پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم: سوائے اس کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا؛ خیر، نیتِ شب حرام، صبح تو ہو، آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے اور مجھے مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم؛ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں، حوض اور حمام اور کڑے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی، جسے تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو، یا یہ حال کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تمھیں جگہ میسر نہیں جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے، ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکے پر تم قابض اور متصرف ہو، لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہّ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا: آپ کو میری نسبت سے سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی۔مگر افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم ومغفور نے متبنّٰی کیا تھا اور جانشین کر مرے تھے۔شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے، صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا، لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم: لیکن آپ نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا؛ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت وحمیت سے بے نصیب ٹھہرتا، اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوگی۔اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم؛ خیر، مقامِ مجبوری ہے، لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے، تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا؛ چراغ کیا، میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی بھی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تھا تو کھانا تیار تھا۔لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی۔ بے کھاوے نکل کھڑا ہوا۔مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ

دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا، کیوں کہ اوّل تو رات کچھ ایسی زیادہ نہیں گئی تھی، دوسرے اس یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے، تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی، لیکن مرزا قصداً اس بات سے معترض ہی نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا یہ حال کے مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ھواللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا عن قریب تمام شب کے واسطے رُخصت ہوا چاہتا ہے، تو بے چارے نے بے غیرت بن کر کہا ''سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا''

مرزا: سچ کہو! نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم: تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا؛ مردِ خدا! تو نے آتے ہی کیوں نہیں کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے؟ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی جن کے کھانے سے فاقہ بہتر، گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی، مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بہت ہمت والوں کا کام ہے ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ جاوں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرما گرم چنے کی دال بنوالاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھے اور تجھے دونوں کو کافی ہوگی، رات کا وقت ہے؛

ابھی کلیم کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوالائے مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے، یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگا گئے اس واسطے کہ کلیم کے روبہ رو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا: ''یار! ہو بڑے خوش قسمت، اس وقت بھاڑ مل گیا، واللہ ذرا ہاتھ تو لگاؤ دیکھو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوش بو، عجیب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا، مگر بُھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا، کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے،

دیکھیے ،اتنی رات گئی ہے،مگر چھدامی کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوتی ہے، بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھیے ، کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے بھئی !تمھیں میرے سر کی قسم ، سچ کہنا ، ایسے خوبصورت خوش قطع ،سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اسے کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں،ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور! دانوں کی رنگت دیکھیے ،کوئی بسنتی ہے،کوئی پستئی ، غرض دونوں رنگ خوش نما، یوں تو صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذّت کو کوئی نہیں پاتا،آپ نے ،وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے۔''

کلیم:''فرمایئے۔''

مرزا:ایک مرتبہ چنا حضرت میکائیل کی خدمت میں،جنھیں رزقِ عباد کا کام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت !میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جوں ہی میں نے زمین سے سر باہر نکالا، تیر ستم چلنے لگے ،ماکولات اور بھی ہیں،مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں،کسی پر نہیں ہوتے نشو ونما کے ساتھ میری قطع و برید ہونے لگتی ہے،میری کونپلوں کو توڑ کر لوگ ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچّے بھی کھا جاتے ہیں۔جب بارآور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے،پکا تو شاخ و برگ بھسن بن کر بیلوں اور بھیسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔رہا دانہ اسے چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں ، بھاڑ میں بھونیں ،بیسن بنائیں ،کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں ، گھنگھیاں پسائیں ،غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی رہتی ہیں،حضرت میکائیل کے دربار میں چنے کا اس طرح بے باکانہ چڑ پڑ بولنا سن کر حاضرینِ دربار اس قدر نا خوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظارِ حکم اخیر رخصت ہوا،سو حضرت !یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آزان پر تیز ہیں۔افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم

نہیں پہنچ سکتا۔ ورنہ میر مدّو کے کبابوں میں یہ خستگی اور سوندھا پن کہاں؟

غرض، مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا، کلیم بھوکا تو تھا ہی، اسے بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی، جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے، گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا، تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چار پائی نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا بیٹھا تھا، جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہ گار یا قفس میں مرغِ نوگرفتار۔ کوئی اور ہوتا تو اس حالت پر تنبیہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے اعمال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجر دم باپ کے ساتھ نماز میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیّار، ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ، دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی، لے کر چمپت ہو گیا، کلیم یوں بھی بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج رات تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سُوا پہر دن چڑھے جاگا، تو دیکھتا کیا ہے فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں، تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا، مرزا کو ادھر کو دیکھا، اُدھر دیکھا، کہیں پتہ نہیں، مسجد بھی ویران، اس میں پانی کہاں؟ صبر کر کے بیٹھ رہا، کہ اللہ کا کوئی بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منھ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دو پہر ہونے آئی، بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا، جوں ہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرض مطلب کرنے کے لیے لپکا، وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ، ڈر کر بھاگا، خدا جانے اس نے اسے

بھوت سمجھا، یا سڑی خیال کیا، کلیم نے بہتیرا پکارا، اس لڑکے نے پیٹھ کر نہ دیکھا، ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا، تو اُلو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منھ ہاتھ دھونے کو پانی اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی مانگے، تا کہ کسی طرح گلی کوچوں میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا، کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں؟ اندر سے آواز آئی۔ ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام ونشان بتاؤ تو معلوم ہو۔''

کلیم: ''میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔''

گھر والے: ''وہ دری تکیہ کہاں ہے، جو رات تمھارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا؟''

تکیہ اور دری کا نام سن کر کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامل تھا کہ اندر سے آواز آئی،

''مرزا زبردست بیگ! دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے، دوڑ کر تکیہ، دری تو اُس سے لو۔''

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نُکّڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست بیگ نے چور چور کر کے جا لیا۔ کلیم نے ہر چند مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم نے اس کا بیان سُنا پوچھا۔ کلیم ہر چند اپنا پتہ بتانے میں جھینپتا تھا، مگر چار و ناچار اسے بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالتِ ظاہری ایسی تیز ہو رہی تھی کہ اُس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔

مشکل الفاظ اوران کے معانی

لفظ	معانی
عمل داری	حکومت، سلطنت
ریزیڈینٹ	مقیم وکیل شاہی جو گورنمنٹ کی طرف سے غیر ریاست میں مقرر ہوتا ہے
اردلی	ساتھ رہنے والا سپاہی، اطلاع لانے اور لے جانے والا ہرکارہ
جمع دار	چند سپاہیوں کا افسر
عالی جاہ	بلند اور بڑے رتبہ والا
منصب	عہدہ، کام
بے عنوانی	بے قاعدگی، بدانتظامی
رشوت ستانی	رشوت لینا، ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنا
روادار	طرفدار، خیرخواہ
اوائل	اول کی جمع ابتدا، شروع
قرابت	نزدیکی، رشتہ داری
تکفل	ذمہ دار ہونا، کفالت
حیات	زندگی، عمر
بے اعتنائی	بے پروائی
وصیت	سفر کرنے یا مرنے کے وقت کی نصیحت

ورثا	وارث کی جمع، مستحق، میراث لینے والا
قطعہ	ٹکڑا، خطۂ زمین
کل کائنات	سرمایہ، پونجی
نمود	دکھاوا
مسخرہ	مذاقیہ
صدہا	سینکڑوں
ادعائی	دعویٰ کرنے والا
دق	ستانا، تنگ کرنا
زبوں	برا، ذلیل
محل سرا	نوابوں کا زنان خانہ
ہم رکاب	ہم راہ، ساتھی، ہم سفر
مسجد ضرار	عہد رسالت میں منافقوں کی ایک مسجد
تسبیحِ بے ہنگام	بے وقت کی تسبیح (پڑھنا)
کھڑنج	اینٹ کا فرش
دفع دخل	اعتراض کا جواب دینا
علیل	مریض، بیمار
خفقان	ایک بیماری کا نام جس میں دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے
عارضہ	دکھ، بیماری
غشی	بے ہوشی

اصرار	ضد کرنا، ہٹ کرنا
استراحت	آرام
اشتداد	زیادتی کرنا، سختی کرنا
متنفس	سانس لینے والا، جاندار انسان
متصرف	قابض
جاہ	عزت، مرتبہ، قدر
حشمت	دبدبہ، شان وشوکت
شمہ	تھوڑی سی چیز، قلیل مقدار
احتمال	شک وشبہ، وہم وگمان
متنبّہ	آگاہ کرنا، خبردار کرنا
بے بہرہ	بے خبر، محروم، آوارہ
حمیت	شرم، غیرت، عزّت
طیش	غصہ
غایت	انتہا، آخر
اشتہا	بھوک
چشم زدن	پلک جھپکتے، فوراً
خوش قطع	اچھی وضع، طریقہ، انداز
ظریف	خوش طبع، لطیفہ گو
رزقِ عباد	عبد کی جمع، بندہ، بندوں کا رزق

قطع و برید	کاٹ چھاٹ،تراش خراش
بارآور	پھلدار
شکم	پیٹ
دندانِ آز	لالچ،حرص
کثیف	گندا ہونا،میلا ہونا
قفس	پنجڑا
تنبیہ	آ گاہ کرنا،جھڑکی،نصیحت
گجردم	تڑکے،بہت سویرے
ہجو	برائی کرنا
منفک	الگ،جدا ہونا
ضماد	لیپ
حقوق	حق کی جمع،درست،واجب معاوضہ
معرفت	پہچاننا،ذریعہ،خداشناسی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ نذیر احمد کے والد کا نام کیا تھا؟

۲۔ مرزا ظاہر دار بیگ کس ناول کا کردار ہے؟

۳۔ مرزا ظاہر دار بیگ کن لوگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ اردو کا پہلا ناول نگار کون ہے؟

۵۔ مرزا ظاہر دار بیگ نے کس کو مسجد میں ٹھہرایا تھا؟

۶۔ درج ذیل الفاظ کے معنی تحریر کیجیے۔

منصب، قرابت، علیل، نمود

تفصیلی سوالات:

۷۔ مولوی نذیر احمد کے حالاتِ زندگی اور ان کی ناول نگاری پر روشنی ڈالئے۔

۸۔ مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار پر تبصرہ کیجیے۔

ڈاکٹر قائدعلی خاں

مختصر افسانہ: تعریف اور مختصر تاریخ

مختصر افسانہ مغربی ادب سے اردو ادب میں داخل ہوا، مختصر افسانہ کو انگریزی میں شارٹ اسٹوری کہا جاتا ہے، اس میں مختصر قصّہ ہوتا ہے اس لیے اس میں پوری زندگی کو پیش نہیں کیا جاتا بلکہ زندگی کا ایک واقعہ، ایک کردار، ایک جذبہ ایک خیال یا زندگی کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے، اختصار، جدّت، وحدتِ تاثر، جامعیت، رومانیت اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

افسانہ ایک جدید ادبی صنف ہے جو وقت کے تقاضوں کے سبب وجود میں آئی اس سے پہلے ناول نگاری کا چلن تھا، امریکی ادیب ایڈگر ایلن پو نے افسانے کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

''مختصر افسانہ ایک ایسی بیانیہ نثری صنف ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے، جو متاثر کن انداز میں لکھی گئی ہو، جس میں وحدتِ تاثر اور جامعیت ہو۔

مختصر افسانے کی امتیازی خصوصیت اختصار ہے اس میں غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی، نہ تو طویل مکالمے ہوتے ہیں نہ منظر نگاری، ہر جگہ اختصار کو مدِّنظر رکھا جاتا ہے۔

مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

۱۔ کہانی　　۲۔ پلاٹ　　۳۔ کردار　　۴۔ مکالمہ

۵۔ پس منظر یا زماں و مکاں　　۶۔ اسلوب　　۷۔ نقطۂ نظر

کہانی:

افسانہ میں ایک کہانی ہوتی ہے جو بہت مختصر ہوتی ہے اس میں انسانی زندگی کا پوا احاطہ نہیں ہوتا

بلکہ زندگی کے کسی ایک پہلو، کسی ایک واقعہ یا مقصد کو چند کرداروں کے ذریعہ انجام تک پہنچایا جاتا ہے جو اپنی جگہ جامع اور مکمل ہوتے ہیں۔

پلاٹ:

افسانہ کا بنیادی عنصر ہے جس میں مرکزی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر واقعات کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ واقعات میں ربط کا ہونا ضروری ہے، ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ سے ایسا تال میل ہو کہ آپس میں فرق کرنا مشکل ہو، یہی پلاٹ کا فن ہے۔

کردار:

کردار نگاری افسانہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، قصہ کو آگے بڑھانے کے لئے کرداروں کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن اختصار کے مدنظر افسانے میں چند کردار ہی پیش کیے جاتے ہیں اور کردار کا ایک ہی رخ پیش کیا جاتا ہے اس لئے چند جملوں میں یا ایک پیراگراف میں اس کردار کی پوری زندگی کا نقشہ پیش کر دیا جاتا ہے۔

مکالمہ:

کرداروں کی آپسی گفتگو مکالمہ کہلاتی ہے، مکالمے کردار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں، کردار جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حیثیت و مرتبہ کی مناسبت سے مکالمے ادا کئے جاتے ہیں، مکالمے غیر فطری نہ لگیں اس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اس میں بھی اختصار کو مدِّنظر رکھا جاتا ہے۔

پس منظر یا زماں و مکاں:

مختصر افسانے میں پس منظر اور زماں و مکاں کا ہونا لازمی ہے۔ ہر کہانی کا کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے جو قصہ اور کرداروں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر زماں و مکاں دونوں کا افسانے

میں بیک وقت ہونا ضروری ہے۔

اسلوب:

ہر افسانہ نگار کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، اسلوب کا اچھا یا برا ہونا افسانے کی کامیابی اور ناکامی کی دلیل ہوتا ہے، افسانہ نگار کو اختصار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے فقرے اور جملوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اور مرکزی خیال کو ہی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، واقعہ اور کردار کو اسلوب کے ذریعہ ہی اُبھارا جاتا ہے۔

نقطۂ نظر:

ہر افسانہ نگار زندگی کے متعلق اپنا ایک الگ نظریہ اور نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ جو اس کے افسانوں میں صاف نظر آتا ہے، جیسے راشد الخیری کے یہاں سماجی اصلاح، سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت اور پریم چند کے افسانوں میں حقیقت نگاری پر زور دیا گیا ہے۔

مختصر افسانے کا ارتقاء

اردو میں مختصر افسانے کے ابتدائی نمونے بیسویں صدی کی ابتدا میں ملتے ہیں، باقاعدہ افسانے کا آغاز پریم چند سے ہوتا ہے، پریم چند نے افسانے کو فنی حیثیت عطا کی، وطن پرستی سماجی اصلاح اور دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ''سوزِ وطن'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ سجاّد حیدر یلدرم رومانی افسانہ نگار ہیں۔ نیاؔز فتح پوری، مجنوؔں گورکھپوری، سلطان حیدر جوشؔ کے افسانوں میں بھی رومانیت ملتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں افسانوی مجموعے ''انگارے'' نے افسانوی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا، ان افسانوں میں رومانیت سے بغاوت، حقیقت نگاری اور جنسی معاملات پر زور دیا گیا ہے، اس میں لکھنے

والے رشید جہاں، احمد علی، سجاد ظہیر اور محمود الظفر تھے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا، جس میں ادب برائے زندگی پر زور دیا گیا، افسانوں میں حقیقت نگاری اور مقصدیت جیسے موضوعات نے فروغ پایا، اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری اور ممتاز مفتی کے نام قابلِ ذکر ہیں اس کے بعد قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ہاجرہ مسرور کے افسانوں نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا، اس کے بعد لکھنے والوں میں قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، اقبال متین، بلراج مین را، انور عظیم، اقبال مجید، سریندر پرکاش اور انور سجّاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر فیروز بیگ

پریم چند

منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں بنارس کے قریب لمہی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والدین نے دھنپت رائے نام رکھا۔ پریم چند کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ ان کی والدہ کا نام آنندی دیوی تھا۔ جب پریم چند آٹھ سال کے تھے ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ ۱۸۹۳ء میں جب آپ کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا تو وہاں مشن اسکول میں چھٹے درجے میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۶ء میں کوئنس کالج بنارس سے نویں جماعت پاس کی ۱۸۹۷ء میں چند ماہ بیمار رہ کر والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۹۸ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایک پرائمری اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار پر اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اسی دوران بی۔ اے۔ کیا پھر ہیڈ ماسٹر اور ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہوئے۔

پریم چند اردو میں جدید افسانے کے بانی اور بڑے افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے شروع ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ ان کے پانچ افسانوں کا مجموعہ 'سوزِ وطن' ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے افسانے حب الوطنی کے جذبہ سے بھرے ہونے کے سبب انگریزی حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ آپ بعد میں پریم چند کے قلمی نام سے لکھنے لگے۔

پریم چند نے افسانے اور ناول کی دنیا میں بہت بلند مقام حاصل کیا ان کی تصانیف میں انسانی زندگی کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے افسانے کو حقیقت سے قریب کیا۔ عوامی زندگی کی ترجمانی کی۔ محنت کش طبقہ کے جذبات واحساسات اور ان کے مسائل کو پیش کیا۔ پریم چند نے پہلی بار

ہندوستان کی دیہاتی زندگی کو موضوع بنایا۔ دیہات میں مہاجن، زمیندار اور پروہت کس طرح کسانوں کا خون چوس رہے تھے یعنی طبقاتی کشمکش، رسم و رواج کی پابندی، عورتوں کی مظلومی چھوا چھوت، مزدوروں کی دشواریاں یعنی پسماندہ طبقے کے مسائل کو پریم چند نے پیش کر کے سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

پریم چند انسانی نفسیات کے نباض تھے ان کے افسانوں میں نہ صرف واقعات حقیقی زندگی کے معلوم ہوتے ہیں بلکہ کردار بھی جیتے جاگتے نظر آتے ہیں اصلی زندگی میں جن سے ہم روز روبرو ہوتے ہیں۔

پریم چند کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے سادہ سلیس، شگفتہ اور رواں زبان استعمال کی۔ اسی لیے مکالمے بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ قاتل کی ماں، زیور کا ڈبہ، گلی ڈنڈا، عیدگاہ، نمک کا داروغہ، قول کا پاس، کفن ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ اور پریم پچیسی، پریم بتیسی، خواب و خیال، خاک پروانہ، آخری تحفہ، زادِ راہ، اور واردات ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔

انہوں نے ایک درجن سے زیادہ ناول لکھے ہیں ان کے ناولوں میں بازارِ حسن، چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، گوشۂ عافیت، بیوہ، غبن، گئودان بہت مشہور ہیں۔

نصاب میں شامل ''قول کا پاس'' افسانہ راجپوتوں کی سچائی، بہادری اور فرض شناسی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانہ کے ذریعہ پریم چند نے بچوں میں قول کے پاس کے جذبے کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

منشی پریم چند

قول کا پاس

اکبر بادشاہ مغلوں کا بہت مشہور بادشاہ گزرا ہے۔اس نے لڑائیاں لڑ کر ہندوستان کا بہت سا حصہ فتح کر لیا تھا۔ایک راجپوتانہ رہ گیا تھا،اکبر نے چاہا کہ اسے بھی فتح کر لے اور وہاں بھی سلطنت کرے۔یہ ارادہ کر کے راجپوتانہ پر فوج کشی کی۔راجپوت اپنا ملک بچانے کے لیے لڑے تو بڑی بہادری سے،مگر آخر کار ان کے پاؤں اُکھڑ گئے،راجپوتوں کا سردار رانا پرتاپ سنگھ اپنے بال بچوں کو لے کر کسی جنگل میں جا چھپا۔

راجپوتوں کے ایک سردار کا نام رگھو پت تھا۔یہ بڑا بہادر اور جری تھا۔اس نے کچھ لوگ اپنی فوج میں داخل کر لیے تھے اور ان کو ساتھ لے کر لڑا کرتا تھا،اس نے بہادری میں اپنا ایسا نام پیدا کر لیا تھا کہ بڑے بڑے مغل اس کا نام سن کر گھبرا جاتے تھے،اکبر کے سپاہیوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس کو پکڑ لیں مگر وہ ایک جگہ کب رہتا تھا جو اسے پکڑ سکتے۔

رگھو پت سنگھ کی ایک بیوی تھی اور ایک اکلوتا بیٹا تھا۔جب وہ اپنے دشمنوں سے لڑنے کو گھر سے نکلا تھا اس کا بیٹا بہت بیمار تھا۔لیکن اس نے نہ تو اپنے بیمار بچے کا خیال کیا،نہ بیوی کا۔مغلوں سے لڑنے کو گھر سے نکل کھڑا ہوا،ہاں کبھی کبھی چوری چھپے سے کسی کو گھر بھیج دیتا تھا اور بیوی بچے کی خبر منگوا لیا کرتا تھا۔

رگھو پت سنگھ کو پکڑنے کو اکبر بادشاہ نے بہت سی فوج بھیجی مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔پھر بادشاہ نے اس کے گھر پر پہرہ بٹھا دیا۔اکبر کا خیال تھا کہ کسی دن رگھو پت سنگھ اپنے بال بچے سے ملنے کو ضرور گھر آئے گا،بس اسی دن سپاہی اس کو پکڑ لیں گے۔ادھر کسی نے رگھو پت سنگھ کو خبر کر دی کہ تیرا بیٹا گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے،چل کر اُسے دیکھ لے۔

یہ سن کر رگھوپت سنگھ، بہت گھبرایا، سورج ڈوب رہا تھا، جنگل میں سفر کرنے کا وقت تو نہیں تھا مگر رگھوپت نے سوچا کہ ''اگر میں نے ذرا بھی دیر کی تو شاید میں لڑکے کی صورت بھی نہ دیکھ سکوں، اسی وقت چلنا چاہیے۔'' رگھوپت سنگھ اسی وقت چلنے کو تیار ہو گیا۔ جب رگھوپت سنگ گھر پہنچا تو دروازے پر اکبر بادشاہ کے سپاہیوں میں سے ایک پہرہ دار نے کہا ''بادشاہ کا حکم ہے کہ تم جہاں ملو پکڑ لیے جاؤ'' رگھوپت سنگھ نے کہا ''میرا لڑکا مر رہا ہے، اسے دیکھنے آیا ہوں، ذرا دیر کے لیے مجھے اندر چلا جانے دو، ابھی دیکھ کر لوٹ آتا ہوں۔ اس وقت جو جی چاہے کر لینا۔ میں راجپوت ہوں، جھوٹ ہرگز نہ بولوں گا۔''

اس پہرہ والے سپاہی نے کہا ''دیکھ آؤ۔'' جب رگھوپت سنگھ گھر میں گیا تو دیکھا کہ لڑکا بے چین ہو رہا ہے اور بیوی فکر کے مارے بے حال ہو رہی ہے۔ میاں کو دیکھ کر بیوی کی ڈھارس بندھی۔ رگھوپت سنگھ نے بچے کو پیار کیا اور دوا کی تدبیریں بتائیں۔ پھر اپنی بیوی سے کہا۔ ''دروازے پر سپاہی کھڑا ہے، میں کہہ آیا ہوں کہ میں قید ہونے کو ابھی واپس آتا ہوں۔'' بیوی نے کہا۔'' ایسا نہ کرو، دوسرے دروازے سے نکل جاؤ'' رگھوپت نے کہا ''یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میں قول دے چکا ہوں، اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے پر آیا اور سپاہی سے کہنے لگا ''لو میں آ گیا اب مجھے پکڑ کر جہاں چاہو لے چلو۔'' سپاہی نے کہا ''تمھیں پکڑنے کو میرا جی نہیں چاہتا، تم بھاگ جاؤ۔'' رگھوپت نے کہا ''بہت بہتر تم نے اس وقت میری مدد کی ہے، جب تم پر برا وقت آئے گا تو میں بھی تمھاری مدد کروں گا۔ یہ کہہ کر رگھوپت آگے بڑھا اور غائب ہو گیا۔

اس بات کو تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ مغلوں کا ایک افسر کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر آ پہنچا۔ پہرے والے سے کہا ''ہم نے سنا ہے رگھوپت ادھر آیا ہے'' پہرے والے نے سچ سچ کہہ دیا کہ ''رگھوپت سنگھ اپنے بیمار بیٹے کو دیکھنے آیا تھا اور میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی'' یہ سن کر افسر نے پہرہ دار کو قید

کرلیا۔ رگھو پت سنگھ کو بھی سپاہی کے قید ہونے کی خبر مل گئی وہ اسی وقت واپس آیا اور آ کر مغل افسر کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہا کہ میں رگھو پت ہوں۔ میں واپس آ گیا ہوں۔ مجھے پکڑ لو اور اس بے گناہ قیدی کو چھوڑ دو۔'' افسر نے رگھو پت کو پکڑ لیا اور قید خانے میں ڈال دیا لیکن سپاہی کو نہ چھوڑا، افسر نے دونوں کے قتل کر نے کا حکم دیا۔

دوسرے دن سپاہی رگھو پت اور پہرہ دار کو میدان میں لائے کہ ان کو قتل کیا جائے۔ دونوں کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ مغل افسر نے جلاّد سے کہا کہ دونوں کی گردنیں اُڑا دو۔ جلاّد نے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ لوگوں نے دیکھا تو اکبر بادشاہ اپنے افسروں کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ سب نے جھک کر سلام کیا۔ اکبر گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور کہنے لگا ''رگھو پت کی گرفتاری کا پورا حال مجھ کو معلوم ہو چکا ہے۔'' پھر پہرہ دار سے کہا ''ہر بھلے آدمی کا دل دوسروں کا دکھ دیکھ کر پگھل جاتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ اس راجپوت کی تکلیف دیکھ کر تمہارا دل بھر آیا تھا۔ اس لیے تم نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو میں نے معاف کیا۔ مجھے ایسے ہی سپاہی چاہیے۔ جو اپنے بادشاہ سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔'' یہ سنتے ہی پہرہ دار خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

پھر اکبر نے رگھو پت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مجھے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ بہادر راجپوت بات کے اتنے دھنی ہوتے ہیں۔ تمھاری بہادری اور ایفائے وعدہ سے میں بہت خوش ہوا، میں نے تم کو بھی چھوڑا۔''
رگھو پت سنگ گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گیا اور کہا ''آپ جس رگھو پت کو اتنی مشکل سے بھی جیت نہ سکے۔ آج اپنی دریا دلی دکھا کر آپ نے اسے جیت لیا۔ آپ بہادروں کی وقعت کرانا جانتے ہیں۔ اب میں کبھی آپ کا دشمن ہو کر تلوار نہ اٹھاؤں گا۔''

جو آدمی اپنے وعدے کے پکّے ہوتے ہیں اور سچائی پر جمے رہتے ہیں اور دوسرے کے دکھ میں مدد کرتے ہیں خدا ہمیشہ ان کی مدد کرتا ہے۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

لفظ	معانی
فتح	جیت
فوج کشی	حملہ، چڑھائی
جری	جنگجو، بہادر
قول	وعدہ
دریا دِلی	فراخ دلی
وقعت	عزت

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ پریم چند کا اصلی نام کیا تھا؟

۲۔ راجپوتوں کے سردار کا نام کیا تھا؟

۳۔ اکبر کس خاندان کا بادشاہ تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ اکبر رگھو پت کی کس بات سے متاثر ہو گیا۔

۵۔ پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام بتائیے۔

۶۔ اکبر نے رگھو پت کا دل کس طرح جیت لیا؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ پریم چند کے حالاتِ زندگی اور ان کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

۸۔ قول کا پاس''سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

سریندر پرکاش

سریندر پرکاش اوبرائے نام ۱۹۳۰ء میں شہر لائل پور فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں والدین کے ساتھ دہلی پہنچے، تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ معمولی درجہ کی ملازمتیں بھی کیں۔ فرضی ناموں سے کہانیاں اور ناول لکھے۔ ریڈیو میں وقتی طور پر اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بی۔اے۔ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ممبئی کی ایک فلم کمپنی سے وابستہ ہوئے۔ وہ زمانہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی۔ ان کے افسانوں میں تجریدی اور علامتی عنصر نمایاں ہے۔ ان کے افسانے 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'، 'سمندر'، 'میدان'، 'پگڈنڈیاں'، 'آتش دان'، 'دیواریں اوران پر لگی تصوریں' ان کے علامتی کردار کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

سریندر پرکاش کا پہلا افسانہ ''دیوتا'' لاہور کے ایک ہفتہ وار ''پارس'' میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' ۱۹۶۸ء میں دوسرا مجموعہ ''برف پر مکالمہ'' ۱۹۸۱ء میں تیسرا مجموعہ ''بازگوئی'' ۱۹۸۸ء میں اور چوتھا ''حاضر حال جاری'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ سریندر پرکاش کو مجموعہ ''بازگوئی'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

سریندر پرکاش نے جدید دور کے انسانی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ علامتوں کے استعمال نے ان کے افسانوں میں معنویت پیدا کردی۔ انھیں زبان وبیان، پر قدرت حاصل ہے۔ سادہ سلیس اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کے گہرے مشاہدے کا پتہ چلتا ہے، واقعات کا گہرا سمندر ہے جو اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے تانے بانے خواب اور حقیقت کے بیچ کی کیفیتوں سے تیار ہوتے ہیں۔ اکثر چیزیں اپنے روایتی تصور

سے ہٹ کر سامنے آتی ہیں اور حیرت واستعجاب کہانی کی دلچسپی کو بنائے رکھتے ہیں۔

سریندر پرکاش کے افسانوں میں لفظوں کے پیچھے ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے۔ کردار زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں۔ ان کی عبارت آرائی گہرے غور وفکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کا مشہور افسانہ ''بجوکا'' ان کے افسانوی مجموعے ''بازگوئی'' میں شامل ہے۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ ''بجوکا'' کے عنوان سے اردو کے علاوہ بعد میں بعض دیگر ہندوستانی زبانوں میں کئی افسانے لکھے گئے۔ ''بجوکا'' افسانے میں ایک پیغام پوشیدہ ہے کہ جو افراد اور قومیں اپنی ملکیت اور پیداوار کی حفاظت خود نہیں کرتیں بلکہ یہ کام دوسروں کو سونپ دیتی ہیں تو نہ صرف جاندار بلکہ بے جان ذمہ داروں میں بھی اس ملکیت یا پیداوار میں سے اپنا حصہ لینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سبق میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح محنت کا پھل ہوری کو ملتا ہے تو بجوکا بھی اپنی محنت کا پھل پانے کا حقدار ہے۔ اس لیے اپنی ملکیت کی حفاظت خود کرنی چاہیے۔

سریندر پرکاش

بجوکا

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت میں سے اُبھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اُس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جواب نہیں رہے۔ایک گنگا میں نہار ہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلے میں مارا گیا۔پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا، اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے اِرد گرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اُس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا اور بوڑھے ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اُن دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے ان کے پانچ بچے۔تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلے میں مارے جانے والے کے۔اب ان سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا، اور اس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنویں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہار ہے تھے۔اس کی بڑی بہو کنویں سے پانی نکال نکال کر ان پر باری باری اُنڈیلتی جا رہی تھی اور وہ اچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اُچھال رہے تھے۔چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔پگڑی باندھ کر

اس نے طاقچے میں رکھے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

''سب تیار ہیں۔؟''اس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ہاں باپو۔''سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے۔بہوؤں نے اپنے سروں پر پلّو درست کیےاور ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا۔سب جھوٹ بول رہے تھے۔ اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے،اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ان کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے ، پوتیاں اور بہوئیں۔ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے جٹ گئیں۔جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے۔اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

ان کا کھیت لہلہا اٹھا تھا۔فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔کتنا اچھا سمے آ پہنچا ہے۔نہ اہلمد کی دھونس، نہ بنیے کا کھٹکا، نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصہ۔اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اٹھے۔

''چلو باپو''اس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی، باقی بچّے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ

گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔

بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں نکل کر گلی میں آ گئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے، سب کے دلوں میں مسرت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکی فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے۔ جو جیپ گاڑی کے پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ غریب کسان بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھلے کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کتاّ بے فکری سے سویا ہوا تھا، دور طبیلے میں کچھ گائیں ۔بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے۔ ان سب کھیتوں کے بعد، ذرا دور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر، چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا۔ جس میں جھونا پک کر انگڑائیاں لے رہا تھا وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے گھاس پر رینگ رہے ہوں۔ وہ سب کھیت کی طرف جا رہے تھے جس کے آگے تھل تھا۔ دور دور پھیلا ہوا، جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی بس تھوڑی بے جان مٹی تھی جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھا اور مٹی یوں بُھر بُھری ہو گئی تھی جیسے ان کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ

تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا۔ جب تک بچے جوان ہوں وہ تھل اس کے کھیت تک نہ پہنچے۔ اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصہ بن چکا ہوگا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اس پر ہوری اور اس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں........

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا

چلتے چلتے ان کے پاؤں مٹی سے اٹ گئے تھے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انھوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی نہ تھا بہنے کو۔ اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے۔ اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آ رہا تھا۔ سب کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھڑی اناج سے، پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ ان سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رُک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھرتی پیدا ہوئی، اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

''اے کون ہے...ے...ے۔؟

اور پھر سب نے دیکھا ان کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے۔ اب وہ

سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلاّیا۔

''ابے کون ہے رے۔ بولتا کیوں نہیں۔کون فصل کاٹ رہا ہے میری۔؟''

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔اب وہ قریب آ چکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سڑاپ سڑاپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے للکارا۔

''کون ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟'' اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سُونت لی اچانک کھیت کے پرلے حصے میں سے ایک ڈھانچہ سا اُبھرا اور جیسے مسکرا کر انھیں دیکھنے لگا ہو۔

''میں ہوں ہوری کا کا۔بجوکا!'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھُٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ان کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آ گئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے۔ وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یُگ۔ اِس کا ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصے سے کانپتی ہوئی آواز نہ سنی اُنھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

''تم.....بجوکا......تم۔ ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا۔ بانس کی پھانکوں سے اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرا میرے گھر کی بے کار ہانڈی سے بنا تھا اور اس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان 'پتلا' میری فصل کاٹ رہا ہے؟''

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور بجوکا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس پر

ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے اُنھوں نے دیکھا۔فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے۔ اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آ گئی وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا۔مگر آج....وہ آدمی لگ رہا۔۔گوشت پوست کا ان جیسا آدمی یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہوا ُٹھا۔اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا۔سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔سب نے اسے سہارا دیا اور اس نے خوفزدہ ہو کر بجوکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تو..... تو مجھ سے بھی طاقتور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے...؟ جس نے تمھیں اپنے ہاتھوں سے بنایا۔اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے۔''

بجوکا حسبِ معمول مسکرار ہا تھا، پھر بولا۔''تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کا کا، میں نے تو صرف اپنے حصے کی فصل کاٹی ہے۔ایک چوتھائی۔

''لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچوں کا حصہ لینے کا۔تم کون ہوتے ہو۔''؟

''میرا حق ہے ہوری کا کا۔ کیوں کہ میں ہوں۔اور میں نے اِس کھیت کی حفاظت کی ہے۔''

''لیکن میں نے تمھیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آ گئی؟''

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔تم بڑے بھولے ہو ہوری کا کا۔خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو۔؟''

''لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی۔؟ میں نے تو نہیں دی تھی!''

''یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی۔جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں،

انگریز شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے۔گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منھ بنایا تھا۔اسی دن ان سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی۔اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی۔میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا۔اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو۔میں نے اپنا حصہ کاٹ لیا۔اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے؟''بجوکا نے آہستہ آہستہ سب کہا۔تا کہ ان سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ سازش ہے۔میں تمھیں زندہ نہیں مانتا، یہ سب چھلاوا ہے۔میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔تم درانتی پھینک دو۔میں تمھیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا۔'' ہوری چیخا،اور بجوکا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی۔پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔اس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور بجوکا کا انتظار تھا۔آج پنچایت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔مقدمے کے دونوں فریق اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا۔سب کی نظریں اس طرف اُٹھ گئیں۔وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آرہا تھا، جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیرارادی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر تعظیماً جھک گئے۔ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اٹھا اسے لگا جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے، پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔وہ اپنے آپ کو تیز پانی میں بےبس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا، ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔اس نے پنچایت کے فیصلے کو قبول

کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کرلیا اور پھر کھڑا ہوکر اپنے پوتوں سے کہنے لگا:

''سنو۔ یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دوری پر ہے۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لیے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا۔ اگلے برس جب ہل چلیں گے۔ بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا۔ تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا۔ بجوکا کی جگہ پر میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا۔ جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہو جائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں۔ وہیں رہنے دینا۔ تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انھیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا۔ کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا۔ آپ سے آپ اُسے زندگی مل جاتی ہے اور اُس کا وجود اُسے درانتی تھما دیتا ہے اور اُس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہو جاتا ہے۔''

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اس کے پوتے اور پوتیاں اس کے پیچھے تھے اور پھر اس کی بہوئیں اور ان کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہو گیا۔ اس کے پوتے، پوتیوں نے اسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا۔ اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اُتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

لفظ	معانی
بجوکا	بانس یا درخت کی شاخوں سے بنا ہوا ایک ڈھانچا جسے ٹوپی اور قمیض یا کرتا پہنا کر کھیت میں آدمی کی طرح کھڑا کر دیتے ہیں۔
خم پڑنا	جھک جانا
اثنا	دوران، بیچ
وجود	ہستی، مراد سماجی حیثیت
پرورش کا بار	پالنے پوسنے کی ذمہ داری
خون کی گردش	رگوں میں خون کا دوران
پنڈا	بدن، جسم
چنگیری	روٹیاں رکھنے کی ڈلیا
تن دہی	پھرتی، مستعدی
اہلمد	(صحیح لفظ: اہلِ مد) عدالت میں پیشکار کا محرر
بیر (ویر)	بہادر
بیر بجرنگی	ہنومان جی کا ایک لقب
جھونا	سونا کے ساتھ بہ طور تابعِ مہمل استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: خدا سونا جھونا پہننا نصیب کرے۔ یہاں مراد ہے: بالیوں

	میں اناج کے سونے جیسے دانے
تھل	ریگستان
بدستور	پہلے کی طرح
چھلاوا	دھوکا، سایہ جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جائے

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ سریندر پرکاش کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ ہوری کس ناول کا کردار ہے؟

۳۔ فصل پک جانے پر ہوری، خوش کیوں تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ سریندر پرکاش کے پہلے افسانے کا نام کیا ہے؟ اور وہ کس رسالے میں شایع ہوا؟

۵۔ 'بجوکا' کسے کہتے ہیں؟

۶۔ ہوری نے اپنے گھر والوں کو کیا وصیت کی تھی؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ سریندر پرکاش کی سوانح حیات اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے

۸۔ سبق 'بجوکا' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہیؔن

مکتوب نگاری: ایک تعارف

لُغت میں خط، نوشتہ، نامہ، مراسلہ، رقعہ اور چٹھّی کو مکتوب کے مترادف بتائے گئے ہیں۔ جس طرح دیگر علوم وفنون کے کچھ اصول اور تقاضے ہوتے ہیں اسی طرح مکتوب نگاری کے بھی چند ضابطے ہوتے ہیں جن کی طرف توجہ دے کر کوئی بھی مکتوب نگار عمدہ اور بااثر خط لکھ سکتا ہے، کیونکہ خط لکھنا بھی ایک فن ہے۔ جس طرح زندگی کے آداب مقرّر ہیں اسی طرح مکتوب نگاری کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں جن کا دھیان مکتوب نگار کو رکھنا چاہیے مثلاً خط میں غیر ضروری باتیں شامل نہ ہوں، زبان صاف، سلیس اور رواں دواں ہو، خط کو گورکھ دھندا نہ بننے دیا جائے، انداز بیان میں خلوص اور دل کشی ہو، ایک ہی بات کو بار بار نہ دہرایا جائے، کسی ایک پہلو کو بلا سبب طول نہ دیا جائے، خط میں ایسی باتیں ہر گز نہ لکھی جائیں جو مکتوب الیہ کی پریشانی کا سبب بن جائیں۔

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے، جو شخص کسی کو خط لکھتا ہے اسے کاتب یا مکتوب نگار اور جسے خط لکھا جاتا ہے اُسے مکتوب الیہ یا مخاطب کہا جاتا ہے۔ زمانے کے نشیب وفراز کے ساتھ مکتوب نگاری کے طور طریق میں بھی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مکتوب نگاری کے فرسودہ اور روایتی طریقے کے تحت مکتوب نگار لمبے چوڑے القاب وآداب استعمال کرتا تھا جس کے سبب آدھا خط تو غیر ضروری اور رسمی باتوں ہی سے پُر ہو جاتا تھا۔ ایسے مکتوبات میں کاتب تصنّع اور بناوٹ سے بھرے جملے اور فقرے استعمال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مسجّع نثر پر زیادہ زور دے کر اصل مقصد یا موضوع کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ لیکن آگے چل کر اس طریقۂ مکتوب نگاری کو ترک کر دیا گیا اور اب جو مکتوبات لکھے جانے لگے ان میں لمبے چوڑے القاب و آداب سے پرہیز اور مقفّٰی اور مسجّع نثر سے گریز کیا جانے لگا۔ مختصر القاب، عام فہم زبان اور صرف ضروری

امور کو ملحوظ رکھا جانے لگا۔اس طرز کے موجد مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ تھے۔

خط عام طور پر تین قسم کے ہوتے ہیں (۱) نجی یا ذاتی (۲) کاروباری (۳) سرکاری

جس طرح شعری و نثری اصناف کے اجزائے ترکیبی اور فنی لوازم ہوتے ہیں اسی طرح مکتوب نگاری کے لیے مندرجہ ذیل اجزائے ترکیبی لازمی ہیں:

۱۔ مکتوب نگار کا پتہ

۲۔ تاریخ ۳۔القاب و آداب ۴۔مضمون خط یعنی اصل مقصد ۵۔خاتمہ

۶۔ مکتوب الیہ (مخاطب کا نام و پتہ)

مکتوب نگاری یوں تو شخصی اظہار کے زمرے میں آتی ہے لیکن مکتوب نگار بعض اوقات ایسی معلوماتی اور عالمانہ باتیں اپنے مخاطب یا مکتوب الیہ کو لکھ دیتا ہے جو اور کہیں نہیں ملتیں، تاہم اس طرح ایک شخصی اور ذاتی تحریر فن پارے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔بعض مفکّرین نے اعلیٰ اور عمدہ قسم کے خطوط کو تخلیقی ادب کے ذیل میں شمار کیا ہے۔

اردو میں منظوم اور منثور دونوں قسم کے مکتوبات کی مثالیں ملتی ہیں۔منظوم خطوط میں اس بے تکلّفی اور بے ساختگی کا فقدان ہے جسے مکتوب نگاری کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔تاریخِ ادب اردو کے مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے کہ جس طرح شعرائے اردو کے تذکرے فارسی میں لکھے گئے اسی طرح شعراء و ادباء نے فارسی زبان میں خط لکھ کر اپنے علم و فضل و کمال کا سکّہ جمانے کی کوشش کی، لیکن یہ سلسلہ تادیر قائم نہیں رہ سکا۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت مرزا غالبؔ کے پیش رو شعرا نے شروع کر دی تھی جن میں غلام غوث بے خبرؔ، غلام امام شہیدؔ اور قتیلؔ جیسے حضرات اور ان کے جیسے بعض معاصرین کے اسمائے گرامی شامل ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بھی خطوط کا مجموعہ شائع نہیں ہوا، صرف نموناً ان کے مکتوبات کی چند نادر

تحریریں ادھر اُدھر مل جاتی ہیں۔اس لیے مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے مکتوبات سے اردو میں باقاعدہ طور پر خطوط نویسی یا مکتوب نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ غالبؔ نے مکتوب نگاری کو جو آب و تاب بخشی وہ آج بھی قائم ہے۔انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا کر القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ ترک کیا جسے مستحسن قدم سمجھا گیا۔ان کے خطوط ادبی،تاریخی، سیاسی، معاشرتی،تہذیبی اور تمدّنی اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط ''عودِ ہندی''، ''اردوئے مُعلّٰی''، ''خطوطِ غالبؔ'' کے زیرِعنوان منظرِعام پر آچکے ہیں۔ غالبؔ کی نثر کو پسند کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک سے وابستہ حضرات یعنی سرسیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی وغیرہ نے اردو میں مکتوباتی ادب کو پروان چڑھایا۔

مولانا محمد حسین آزادؔ، اکبرؔ الہ آبادی، چودھری محمد علی رودولوی اور مولانا محمد علی جوہرؔ نے جو خطوط اپنی ذاتی ضرورت کے تحت اپنے عزیز و اقارب کو لکھے وہ اردو ادب میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔علّامہ اقبالؔ اور مولانا ابوالکلام آزادؔ ایسے مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط کے مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہوئے۔اقبالؔ کے خطوط کے مجموعے عالمانہ شان رکھتے ہیں۔ابوالکلام آزادؔ نے قلعہ احمد نگر کے قید خانے میں رہتے ہوئے جو خطوط حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے ان کا مجموعہ بعنوان ''غبارِ خاطر'' شائع ہوا۔

مہدی افادی نے یوں تو اپنے کئی معاصرین کو خطوط لکھے،لیکن جو رومانی خطوط انہوں نے اپنی اہلیہ کے نام تحریر کیے وہ اردو نثر کا بہترین نمونہ قرار دیے جاتے ہیں۔مولوی عبدالحق پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر آل احمد سرورؔ اور عبدالماجد دریا آبادی جیسے ناقدین و محققین کے خطوط ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے معلومات کا خزانہ ہیں۔

منشی پریم چند، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، میراجیؔ، سیّد سجاد ظہیر اور سعادت حسن منٹو وغیرہ کے خطوط دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں۔قراۃ العین حیدر کے خطوط کے مجموعہ ''اوراق پریشاں'' کو پڑھنے

پر ناول اور افسانے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر نے اپنی دو بیویوں یعنی صفیہ اختر اور خدیجہ اختر کے نام جو خطوط لکھے ان کا مجموعہ ''خاموش آواز'' کے عنوان سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی' بھوپال سے شائع ہوا۔صفیہ اختر نے جو خطوط جاں نثار اختر کو لکھے ان کا مجموعہ ''زیرلب'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

چونکہ خطوط یا مکتوبات کی ادبی اہمیت مسلّم ہے، اس لے بعض ادبی جریدوں اور اخبارات نے اردو سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خطوط کو یکجا کر کے خصوصی شمارے ترتیب دیے۔مشہور شاعر وادیب ساغر نظامی نے اپنے اخبار''ایشیا'' کا مکاتیب نمبر''نگارنامہ'' کے عنوان سے شائع کیا۔جسے تاریخی اہمیت وحیثیت حاصل ہے۔اسی طرح ''نقوش''(لاہور) کے مدیر محمد طفیل نے ''خطوط نمبر اور''مکاتیب نمبر'' شائع کر کے اہم ادبی فریضہ انجام دیا۔موجودہ عہد میں موقع بہ موقع اردو کے اہل قلم حضرات کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے ادب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مرزا غالبؔ

مرزا اسد اللہ خاں نام، اسدؔ اور غالبؔ تخلص۔ مرزا نوشہ لقب، اور نجم الدولہ، دبیر الملک، نظامِ جنگ خطاب تھا۔ غالبؔ کی ولادت ۸؍رجب ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۷؍دسمبر ۱۷۹۷ء کو بمقام آگرہ ہوئی۔ غالبؔ کا سلسلۂ نسب ترکمانوں سے ملتا ہے۔اس خاندان کے لوگ سلجوقی ترک کہلاتے تھے۔

غالبؔ کے والد کا نام عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ غالبؔ کے والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمے داری ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے اٹھائی۔ چند سالوں بعد غالبؔ کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا لہٰذا غالبؔ با قاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ یہ بات مشہور ہے کہ غالبؔ نے ایک نومسلم پارسی عبدالصمد سے فارسی پڑھی تھی جب کہ ابتدائی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی تھی۔ غالبؔ کو چچا کی جاگیر کے معاوضے میں سات سو روپیہ سالانہ پینشن ملنے لگی۔ غالبؔ آگرہ کو خیر باد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ دہلی میں ان کی شادی مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالبؔ اب مستقل طور پر دہلی کے ہو رہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ سے قربت ہو جانے کے سبب انھیں پچاس روپے ماہانا پینشن ملنے لگی۔ غالبؔ سیاحت پسند طبیعت کے مالک تھے۔اس لیے انھوں نے کلکتہ، لکھنؤ اور رام پور وغیرہ مقامات کا سفر کیا۔آخری عمر میں غالبؔ سخت بیمار رہنے لگے اور دن بدن ان کی صحت گرتی گئی۔آخر کار ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں آپ نے انتقال فرمایا۔آپ کو درگاہ نظام الدین اولیاء کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔

غالبؔ کو یوں تو اوائل عمری سے ہی علم و ادب میں دلچسپی تھی لیکن مولانا فضل حق خیرآبادی سے ملاقات ہونے کے بعد ان کے مزاج میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان سے غالبؔ کی شاعری کو پر لگ گئے۔

غالبؔ نے فارسی اور اردو میں جو کلام یادگار چھوڑا اس کی بنیاد پر ان کا شمار عالمی ادب کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شعری تصانیف میں ''دیوانِ غالبؔ''، کلیاتِ نظم فارسی'' مثنوی ''شانِ نبوت وولادت'' اور ''چراغِ دیر'' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

چونکہ غالبؔ نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے تاہم انھوں نے نظم کے ساتھ نثر کو بھی اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ ان کی نثر کا سرمایہ خطوط، تقاریظ، دیباچوں اور رسالوں پر مشتمل ہے۔ لیکن بہ حیثیت نثر نگار خطوط نویسی کے حوالے سے انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

غالبؔ نے ۱۸۴۸ء کے آس پاس اردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ خطوط نویسی کا سلسلہ ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اردو سے قبل غالبؔ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ انھوں نے بیس اکیس برس تک اپنے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں، محسنوں اور بزرگوں کو جو خطوط اردو میں لکھے وہ نثر کا عظیم سرمایہ ہیں۔ اُن کے خطوط کے مجموعے ''اردوئے معلیٰ''، ''عودِ ہندی'' اور ''خطوط غالبؔ'' ادبی حلقوں میں حسنِ قبول حاصل کر چکے ہیں۔

غالبؔ کے خطوط اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی حالات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ خطوط غالبؔ کے دل و دماغ اور خیالات و رجحانات کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ انھیں زبان و بیان کا حسین و دلکش مرقع کہا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کی شوخی، ظرافت، شرافت، جدت و ندرت، نکتہ سنجی، منظر نگاری، بذلہ سنجی اور بے تکلفی کی جھلک ان خطوط میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں غالبؔ نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔

نصاب میں غالبؔ کے دو خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں پہلا خط میاں داد خاں سیّاحؔ کے نام لکھا گیا ہے۔ اس خط میں غالبؔ نے اپنی ضعیفی اور خرابیٔ صحت کا ذکر کرتے ہوئے اشعار کی اصلاح سے معذرت چاہی ہے۔ گرمی کے سخت موسم اور ایک مصوّر کی لاپرواہی کا شکوہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے

عزیز شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کا ذکر مشفقانہ انداز میں کیا ہے۔

دوسرا خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہے جس میں غالب نے یہ ظاہر کیا ہے کہ خط کا سرنامہ دیکھ کر انھیں فرحت و خوشی ملی۔ اور یہ افسوس بھی کیا کہ وہ کمزوری کے سبب خط لکھنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ سرور کے چچا اور مولوی سید برکات حسین کا ذکر بھی خط میں آیا ہے۔

یہ دونوں خطوط مرزا غالب نے اپنے اندازِ خاص میں تحریر کیے ہیں جن کا ایک ایک لفظ انکساری، خلوص اور محبت کی گواہی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ دونوں خطوط محض رسمی نہ ہو کر اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کو حالِ دل سنانے کا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا غالبؔ

(۱)

بنام میاں داد خاں سیّاحؔ

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیّاحؔ کو غالبِ ناتواں نیم جاں کی دعا پہنچے۔ بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آ گے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہوسکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب، میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔

دھوپ کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں میں لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔ تمہاری غزلیں میر ابراہیم علی خاں بہادر کی غزلیں، میر عالم خان بہادر کی غزلیں، حکیم میر احمد حسین صاحب کی غزلیں اور کیا کہوں کس کس کی غزلیں۔ یہ سب ایک جگہ دھری ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گرمی خیر سے گذر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔

تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقش اتروانا بھی ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم

یہ پانچواں مہینہ ہے۔آج تک نہیں آئے۔

آغا غلام حسین خاں صاحب کا قطعہ پہنچا۔اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے۔اب اصلاح دے کون؟ میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔بارے ایک میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہؔ بہ سواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا۔اس کو موقعہ ومحل بتا دیا، جو کہتا گیا۔اسی طرح وہ بنا تا گیا۔وہ قطعہ کا کاغذ بعد اصلاح کے ''اکمل المطابع'' میں بھیج دیا۔ہفتہ آیندہ میں تم بھی دیکھ لو گے۔

۱۱رجون ۱۸۶۷ء　　　　　　　　مرگِ ناگاہ کا طالب غالبؔ

(۲)

بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ

بندہ پرور،

بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن بعارضہ تپ ولرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ ضعف کی شدّت کہ خط لکھنے سے معذور ہیں! خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارا خط تمہارا دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دونی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا دلِ سودازدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصدِ ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔ آپ کے عم عالی مقدار اور بزرگ آموزگار کو میرا اسلام مع صنوف اشتیاق والوف احترام

جناب چودھری صاحب آؤ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا، تم معرف ہونا کہ غالبؔ یہی ہے۔ اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا۔ پیرومرشد نے مجھے گلے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ ''غالبؔ تو اچھا ہے؟'' میں عرض کرتا ہوں کہ ''الحمدللہ، حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''مولوی سید برکات حسین تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔'' جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے۔ ضعف قویٰ واضمحلال کہتے تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا۔ انکی غمخواری اور دردمندنوازی کا دم بھرتا۔

در کشا کش ضعفم نِگسلد رواں از تن
این کہ من نمے میرم ہم زنا تو انیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا ''بوستانِ خیال'' کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں؟ حضرت سچ تو یوں ہے کہ تمہارے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے، سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رویا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشین ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے ہیہات:

منحصر مرنے پہ ہو، جس کی امید　　　نا امیدی اس کی، دیکھا چاہیے

اے حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام لیجیے۔ کاغذ باقی نہیں رہا۔ اپنے سب بھائیوں کو مع میر وزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجیے گا۔

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
لقب	وہ نام جو کسی خاص خوبی یا تعریف کے سبب دیا جاتا ہے۔
خطاب	وہ اعزازی نام جو سرکار یا حکومت کی جانب سے عطا ہو۔
سلسلۂ نسب	خاندان یا نسل کا تعلق
دیباچہ	پیش لفظ، تمہید، کتاب کا مقدمہ
مرقع	البم، تصویر
نکتہ سنجی	عقل مند، ہوشیار، خوش بیان
سعادت	خوش نصیبی، نیک بختی
اقبال نشان	خوش نصیبی، صاحبِ نصیب
ناتواں	کم زور، مضمحل
رعشہ	کپکپی، تھرتھراہٹ
ضعفِ بصارت	آنکھوں کی ناطاقتی یا کم زوری، کم دکھائی دینا
بدستور	قاعدے کے مطابق، جوں کا توں، حسب معمول
گوشۂ تاریک	اندھیرا یا تاریک کونہ
مصوِّر	نقاش، تصویر بنانے والا
شبیہ	شکل، صورت، تصویر

قطعہ	ٹکڑا، حصّہ، نظم کی وہ قسم جس میں کوئی ایک چیز یا خیال بیان کیا جائے۔
اصلاح طلب	جس میں سدھار یا درستی کی ضرورت اور گنجائش ہو
مرگِ ناگاہ	اچانک یا یکا یک آنے والی موت
طالب	مانگنے یا چاہنے والا، امیدوار
بندہ پرور	غلام کو پالنے والا، بندہ نواز
سرنامہ	خط کی پیشانی، خط لکھنے والے کا پتہ اور نشان
مفہوم	سمجھا گیا، جو سمجھ میں آئے
عارضہ	مرض، بیماری، دکھ، غم
تپِ لرزہ	بخار کے سبب ہونے والی تھرتھراہٹ یا کپکپاہٹ
رنجور	دکھ، درد، بیماری
قاصد	پیغام لانے والا، نامہ بر، چٹھّی رساں
ضعف	کمزوری، ناتوانی
شدت	سختی، تکلیف، زیادتی، کثرت
معذور	مجبور، ناچار، اپاہج
فرحت	خوشی، شادمانی، سرور
دونی مسرت	دوہری خوشی، شادمانی، انبساط
دل سودازدہ	دیوانگی، پاگل پن میں مبتلا دل
جنابِ ایزدی	بارگاہِ الٰہی، اللہ کے حضور

سرگرمِ دعا	پُرجوش طریقے سے دعا کرنا یا دینا
عم	چچا، والد کا بھائی
عالی مقدار	جس کا شمار اعلیٰ اور بلند مرتبہ لوگوں میں ہو
بزرگ آموزگار	کسی فن میں مہارت یا دسترس رکھنے والا استاد
اشتیاق	شوق، آرزو، تمنا
الوفِ احترام	ہزار توقیر و عزت کے ساتھ
کفِ پائے مبارک	پاؤں کے تلوے
معرف	تعریف کیا گیا، نشان کیا گیا
عزمِ قدم بوسی	قدم چومنے کی نیت یا ارادہ، کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش
ضعفِ قویٰ	دماغی کمزوری
اضمحلال	افسردگی، کاہلی، سستی
تصدیق	صداقت، سچ کی تائید، ثبوت
دانہ ڈالنا (محاورہ)	کسی کو پھنسانے کی کوشش کرنا
صغریٰ	چھوٹی لڑکی، سب سے چھوٹی چیز
کبریٰ	بہت بڑی، بہت بزرگ، اکبر کا مؤنث
دل نشین	دل میں بیٹھنے والا، دل پر اثر کرنے والا
تسکین	آرام، تسلی، اطمینان
ہیہات	افسوس، ہائے ہائے

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ غالبؔ کے پاس کس کا قطعہ پہنچا تھا؟

۲۔ غالبؔ تمام دن کہاں پڑے رہتے تھے؟

۳۔ لفظ ''کُبریٰ'' کا مذکر لکھیے۔

مختصر سوالات:

۴۔ لفظ ''احترام'' کے مترادف الفاظ لکھیے۔

۵۔ 'دانہ ڈالنا' محاورے کا مطلب لکھتے ہوئے اُسے اپنے جملے میں استعمال کیجیے۔

۶۔ غالبؔ نے کن کن شعرا کی غزلیں ایک جگہ دھری تھیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ غالبؔ کی سوانح حیات لکھتے ہوئے ان کی مکتوب نگاری کی خوبیاں بیان کیجیے۔

۸۔ غالبؔ کے خط 'بنام میاں دادخاں سیّاح' کا خلاصہ لکھیے۔

ڈاکٹر شاہدالحق چشتی

مضمون نگاری وانشاپردازی: ایک تعارف

اردو میں صنفِ مضمون نگاری وانشاپردازی بھی جدید اصنافِ ادب مثلاً ناول، ڈراما، افسانہ، مختصر افسانہ وغیرہ کی طرح ہی مغربی ادب سے آئی اور ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے رائج ہوئی۔ اردو کے کچھ ادیبوں کے نزدیک مضمون نگاری اور انشاپردازی علاحدہ علاحدہ صنف ہیں۔ جب کہ بعض ادیبوں کے مطابق دونوں ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔

مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری یا انشا پردازی کو سمجھنے کے لیے دونوں کی تعریف سمجھنا ضروری ہے۔

کسی عنوان پر اپنے خیالات کو ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دینے کو مضمون کہتے ہیں۔ مضمون کو انگریزی میں Essay کہا جاتا ہے۔

لفظ Essay کے لیے اردو میں سب سے پہلے لفظ مضمون کا استعمال سرسیّد احمد خاں نے کیا۔ صنفِ مضمون کی جامع تعریف 'انسائیکلو پیڈیا آف بری ٹینیکا' میں وضاحت وصراحت کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس کا ترجمہ مشہور نقاد نظیر صدیقی نے اس طرح کیا ہے۔

> ''ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے 'ایسے' اوسط لمبائی کا ایک ایسا
> مضمون ہے جو عموماً نثر میں ہوتا ہے اور جس میں سہل اور سرسری
> انداز میں کسی موضوع سے اور سچ پوچھیے تو صرف اُس موضوع سے
> بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔''

مشہور انگریزی نقاد جانسن نے انشائیہ (Essay) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔''

یعنی انسان کے ذہن میں کسی خاص موضوع پر جو خیال آتے ہیں، انھیں ترتیب کے ساتھ تحریر کر دینے کو انشائیہ کہتے ہیں۔ڈاکٹر محمد حسنین انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

''انشائیہ نثر کی غزل ہے جو واردات قلب سے زیادہ محشرِ خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔''

انشائیہ کے متعلق مشہور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں:-

''انشائیہ کا خالق اُس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ کپڑے اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہو کر حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرّت سے اپنے احباب سے محوِ گفتگو ہو جاتا ہے۔''

انشائیہ کے متعلق مذکورہ خیالات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ نگاری یا انشا پردازی وہ تحریر ہے جس میں خیالات کو مربوط انداز میں تحریر کرنا لازمی نہیں۔ یہ ایک ذہنی اپج ہے۔انسان کے ذہن میں جو خیالات بے ترتیب پیدا ہوتے ہیں انھیں وہ ایک ترتیب سے اپنے مذاق اور مزاج کی چاشنی میں ڈبو کر تحریر کرتا ہے۔یعنی انشائیہ میں انشائیہ نگار کی خوش طبعی اور شگفتہ بیانی کے ساتھ ہی بے تکلّفی اور سادگی کی جھلک بھی ملتی ہے۔انشائیہ میں اختصار ہوتا ہے اور موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی اس میں بے ربط خیال کے ساتھ ہی تحریر کی آزادی بھی ہوتی ہے۔لہٰذا تخلیق نگار کی تخلیقی صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔انشائیہ میں مسرّت وانبساط کی کارفرمائی اور داخلی خیالات کی شمولیت کی وجہ سے اس کے مطالعے سے دنیا کی فکروں سے نجات ملتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری اور انشا پردازی کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔سب سے پہلے سرسیّد نے مضمون نگاری اور مولانا محمد حسین آزادؔ نے انشا پردازی کو فروغ دیا۔سرسیّد جو اپنی قوم وملک کے بہت بڑے ہمدرد اور راہنما تھے انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قوم وملّت کی ابتری ، بدحالی اور جہالت و پس ماندگی دور کرنے کی غرض سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔جن میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، تاریخی، فکری، معاشرتی اور علمی وادبی موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی۔رسالہ ’’تہذیب الاخلاق‘‘ میں اس قسم کے مضامین شامل کیے گئے۔اسی طرح مولانا حالیؔ نے مقالاتِ حالیؔ میں اور مولانا شبلیؔ نے مقالاتِ شبلی میں علمی ، ادبی ، تحقیقی اور مذہبی موضوعات پر علاحدہ سے مضامین لکھے۔اسی طرح انشائیہ نگاری کی مثالیں ہمیں مولانا محمد حسین آزادؔ کی تصنیف ’نیرنگِ خیال‘ اور اس کے بعد رسالہ ’مخزن‘ میں ملتی ہیں۔جس کے ایڈیٹر سر عبدالقادر تھے۔

اردو میں مضمون نگاری اور انشا پردازی کی لمبی روایت میں سرسیّد اور مولانا محمد حسین آزادؔ کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، عبدالحلیم شررؔ، مولانا وحید الدین سلیمؔ، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، قاضی عبدالغفاّر، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ظفر علی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرورؔ، مجنوںؔ گورکھپوری، محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر احتشام حسین، کلیم الدین احمد، پروفیسر خورشید الاسلام، احمد جمال پاشا، کنہیاّ لال کپور، نظیر صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

بیسویں صدی میں اردو کے مایۂ ناز ادیب، مفکر اور عظیم مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد ۱۱/نومبر ۱۸۸۸ء کو مکّہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ آزاد کا پورا نام محی الدین احمد تھا۔ قلمی نام (تخلص) آزاد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ لیکن ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خیرالدین تھا، جو بہت بڑے عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ بنگال کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب (غدر) کے بعد مولانا خیرالدین بنگال سے ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے۔ وہاں اُن کی شادی مدینہ منورہ کے ایک جیّد عالم دین شیخ محمد ظَہر کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جب مولانا آزاد تقریباً دو برس کے تھے تو ان کے والد ۱۸۹۰ء میں کلکتہ لوٹ آئے اور یہیں مستقل قیام کیا۔ آزاد کی ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہی ہوئی۔ آزاد نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور بنگالی زبان کے ساتھ ہی ہندی زبان میں بھی مہارت حاصل کی۔ علاوہ ازیں انھیں علم فقہ میں بھی دسترس حاصل تھی۔ علم الحساب، فلسفہ، سائنس اور تاریخِ عالَم کا علم بھی انہوں نے اپنے وقت کے جیّد علما سے حاصل کیا۔ تیرہ برس کی عمر میں آزاد کی شادی زلیخہ بیگم سے ہوئی۔ آزاد نے بچپن میں ہی صحافت کے میدان میں قدم رکھ لیا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں محض ۱۲/برس کی عمر میں انہوں نے ہفتہ وار رسالہ 'المصباح' جاری کیا۔ جب وہ ۱۴/برس کے ہوئے تو انھوں نے مشہور رسالہ 'مخزن' میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ اور اپنے ہم عمر طلبا کو پڑھانے بھی لگے۔ وہ اپنے دور کے طلبا سے بہت آگے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے کلکتہ سے رسالہ 'لِسّان الصدق' جاری کیا۔ جو بعد میں بہت مشہور ہوا۔ تقریباً ۱۶/برس کی عمر میں انھوں نے ایک منظوم رسالہ 'نیرنگ عالم' شائع کیا۔

اردو ادب میں مولانا آزاد کا عظیم کارنامہ ہفتہ وار اخبار 'الہلال' تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں جاری کیا۔ اس اخبار میں انہوں نے انگریزی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد پر مضامین لکھے۔ اور نوجوان مسلمانوں میں آزادی کے جذبات بیدار کیے۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے ۱۹۱۴ء میں اس اخبار پر پابندی لگا دی۔ مولانا نے اپنے اس مشن کو جاری رکھنے کے لیے اخبار 'البلاغ' جاری کیا۔ اس اخبار کا مقصد بھی مسلم نوجوانوں میں قومیت کا جذبہ بیدار کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کو مضبوطی دینا تھا۔

پہلی جنگ عظیم (عالمی جنگ ۱۸-۱۹۱۴ء) کے دوران ہی خلافت تحریک شروع ہوئی۔ جس کا مقصد عالمی سطح پر انگریزوں کی مخالفت کرنا تھا جس کی راہنمائی ٹُرکی کی عظیم 'عثمانی سلطنت' کر رہی تھی۔ (جو اس پہلی عالمی جنگ میں بھی انگریزوں کے خلاف اتحادیوں کے ساتھ شامل تھی۔) دنیا کے تمام مسلمان انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ مولانا نے مناسب موقع دیکھ کر 'خلافت تحریک' کی حمایت کی اور ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اُکسا کر ان میں سیاسی بیداری پیدا کی اور معاشرتی اصلاح کی جانب راغب کیا۔ اس سے ہندوستان میں مولانا کی مقبولیت بے حد بڑھ گئی۔ لہٰذا انگریزی حکومت نے 'البلاغ' کو غیر قانونی قرار دے کر مولانا کو گرفتار کر لیا اور رانچی جیل میں ڈال دیا۔ جہاں وہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک قید رہے۔

مولانا چونکہ بچپن سے ہی سیاست اور صحافت میں دلچسپی رکھتے تھے لہٰذا ان دنوں ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں مہاتما گاندھی کی 'تحریکِ عدم تشدد' سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ تحریکِ آزادی میں شامل ہو گئے۔ وہ دو مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ دوسرے دور کے عہدِ صدارت (۴۵-۱۹۴۰ء) میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف 'بھارت چھوڑو تحریک (Quit India Movement -1942)' شروع ہوئی۔ ملک کی آزادی کے بعد وہ

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم بھی بنائے گئے۔انھوں نے وزیرِ تعلیم رہتے ہوئے ہندوستان کی تعلیمی پالیسی مرتّب کی۔ان کے عہدِ وزارت میں ہی ہندوستان میں آئی آئی ٹی (IIT)، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔مولانا کی عظیم سیاسی ،سماجی ، مذہبی ، معاشرتی اور تعلیمی اصلاحات اورخدمات کی بنا پر حکومتِ ہند نے ۱۹۹۲ء میں انھیں ہندوستان کے سب سے بڑے شہری اعزاز 'بھارت رَتن' سے نوازا۔۲۲ رفروری ۱۹۵۸ءکو ۶۹ ر برس کی عمر میں قوم ملک کا یہ عظیم راہبر اس جہانِ فانی سے رُخصت ہوا۔ان کی یاد میں ان کے یومِ ولادت ۱۱ رنومبر کو ہر سال ملک بھر میں ''قومی تعلیمی دن''(National Education Day) کے طور پر منایا جاتا ہے۔

مولانا آزادؔ نہ صرف ایک اعلیٰ قدر سیاست داں تھے بلکہ وہ ایک عظیم مصلحِ قوم، ماہرِ تعلیم، شاعر، مفکر، عمدہ خطیب، اعلیٰ درجے کے صحافی اوراردو کے عظیم نثر نگار بھی تھے۔اُن کی ادبی وفکری عظمت ان کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' سے ثابت ہوتی ہے علاوہ ازیں ان کے خطوط کا مجموعہ 'غبارِ خاطر' (جو انھوں نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان قلعہ احمد نگر جیل سے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے تھے،لیکن اپنے پاس ہی رکھے) بھی اردوادب میں ان کی عظمت کا امین ہے۔انھیں زبان پر عبور حاصل تھا۔وہ اپنے خیالات کو آسان اور بامحاورہ زبان میں پُراثر طریقے سے ظاہر کرتے تھے۔ان کا انداز خطیبانہ ہوتا تھا۔ان کی تحریر وتقریر میں بلندیِ فکر، دردمندی، عظمتِ نفس، علمیت، متانت وسنجیدگی اورحُسن ورنگینی کے احساسات کے ساتھ ہی طنز وظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔جو پڑھنے اور سننے والے کے دل ودماغ پر اثر کرتے ہوئے اُس کی روح کو بیدار کرتی ہے۔اوراُسے حرکت وعمل پر مجبور کرتی ہے۔سطحی اشتعال انگیزی اور لفظی بازی گری کے بجائے آزادؔ اپنی تحریر وتقریر سے قوم کے فکر وشعور کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آزاد کی ایک اورادبی تخلیق ان کی خودنوشت سوانح ''تذکرہ'' ہے۔

شامل نصاب مضمون ''حقیقی عظمت'' ان کی اسی خودنوشت ''تذکرہ'' سے اخذ کیا گیا ہے۔جس میں انھوں نے اپنے اسلاف کے کردار واعمال کا ذکر کرتے ہوئے فخر محسوس کیا ہے۔اس مضمون میں آزاد نے اسلام اور مسلمانوں کی شاندار پارینہ روایات اور کارناموں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔اور بتایا ہے کہ انسان کے خودکردہ (ذاتی اعمال) سے ہی اس کو عزت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

حقیقی عظمت

انسان کے لیے معیارِ شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں۔ اربابِ ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت ورفعت کی تعریف صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔ نپولین کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرِک اعظم کی قبر پر گیا تو دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار قبر پر لٹک رہی ہے۔ نپولین نے تلوار اٹھا کر ایک ساتھی کے حوالے کی اور کہا کہ پیرس کے عجائب خانہ کی نذر کر دوں گا، یہ سن کر جنرل نے کہا ''اگر مجھ کو ایسی باعظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کو نہ دیتا۔'' نپولین نے کہا ''کیا میرے پاس تلوار نہیں؟''

پس سچی عظمت کی راہ یہ نہیں ہے کہ فریڈرک کی عظمت یافتہ تلوار لوگوں کو دکھلائیں۔ سچی عظمت وہ ہے جو خود ہماری تلوار کو ہماری نسبت سے ملی ہو اور اگر ایسا ہو گیا ہے تو یہ بس کرتا ہے۔ ہم کو اپنی نیام میں صرف اپنی ہی جوہر دار تلوار رکھنی چاہیے۔ دوسروں کی تلوار کی نمائش سے اگر دیکھنے والوں کا تعجب واحترام حاصل بھی کر لیا گیا تو اس کے اصلی مالک ہم نہیں ہیں، تلوار کا مالک ہے!

خاندان کے فخر کا بُت بھی دنیا کے عہدِ جاہلیہ کی ایک یادگار ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بُتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ ہم آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ ''عمل'' کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔

بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ کی نسبت اس سے زیادہ ہم کیا جانتے ہیں کہ مسلمان تھے۔ اور سلمان فارسیؓ سے جب اس کے خاندان کا حال پوچھا گیا تو اس نے کہا ''سلمان بن اسلام'' اور جب فاروقِ اعظمؓ کے جنازہ پر نماز کی صفیں کھڑی ہوئیں تو ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے اور صہیب رومیؓ امام۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرتی ترقی اور قدرتی حقوق کے قیام کے لیے نسب و خاندان کے امتیازِ باطل سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہی چیز ہے جو انسان کو اس کی ذاتی قوتوں کے استعمال اور ان کے ثمرات سے محروم رکھنا چاہتی ہے اور اس خلافِ فطرت راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ ایک شخص کو باوجود عدم استحقاق ذاتی مستحق شرف سمجھا جائے اور دوسرے کو باوجود استحقاقِ ذاتی محروم کر دیا جائے۔ اسلام نے اِنَّ اَکْرَمَکُم عِندَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ اور لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی کے قانونِ عام کا اعلان کر کے اسی مہلک روگ کو مٹانا چاہا۔ اور قرآن نے بتلایا کہ دنیا کی تمام قدیم صداقتیں بھی اسی قانون کی طرف دعوت دیتی رہی ہیں۔ صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں بھی یہی تھا۔ لیکن افسوس کہ غرورِ نسل و وطن کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پھر جوڑ لیے گئے اور نئے نئے بھیسوں میں پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ اب بہت کم سر ملیں گے جو نشۂ باطل سے سرگراں نہ ہوں۔ الا ماشاءاللہ پس الحمدللہ کہ اس کی طلب ہے اور نہ اس پر اعتماد اور نہ نااہلوں کے اس فریبِ عزت اور سرابِ شرف کی ضرورت۔ طلب جس گوہرِ مقصود کی ہے وہ توفیقِ عمل ہے اور اگر کچھ اعتماد ہے تو اپنی عجز و شکستگی اور اس کی نظرِ کرم کی عاجز نوازیوں پر۔

البتہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کے ذریعہ وہ اس دنیا میں اپنے بندوں کو سعادت بخشتا ہے ایک بڑی نعمت آباءِ صالحین کے لیے یہ ہے کہ اولادِ صالح عطا فرمائے اور اولاد کے لیے یہ ہے کہ والدین صالح ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی خاندان میں عرصے تک علم و صلاح کا باقی و جاری رہنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان دونوں نعمتوں سے فیض یاب ہوں آباء کو اولادِ صالح اور اولاد کو آباءِ صالح نصیب ہوں۔ پس بلاشبہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں کہ مجھ کو ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں

صدیوں سے سلسلۂ علم وارشاد قایم وجاری ہے، اور جس کے اسلافِ کرام کے اعمالِ صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے اخلاف تک منتقل ہوتا آیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے اخلاف کو حق گوئی وحق پرستی اور طریقِ استقامت وعشقِ حق میں سرفروشی وجاں سپاری اور مغرورانِ تاج وتخت و بندگانِ مال وجاہ کے مقابلے میں بے نیازی وسرگرانی ہمیشہ اپنے اسلاف کے ورثہ میں ملی ہے۔ اسی کو اپنا موروثی خزانہ اور اسی کو اپنا خاندانی تاج وتخت سمجھتا ہوں۔

اگر یہی غرورِ نسب وخاندان ہے تو اس کے اعتراف میں مجھے کچھ باک نہیں۔ بلاشبہ اسلاف کے ورثۂ علم اور حق پرستی کو دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اور نہیں چاہتا کہ کبھی اس نشہ سے میرا دماغ خالی ہو۔

بڑی سے بڑی آرزو جس کو اپنے دل میں رکھ سکتا ہوں یہی ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیوں تک اپنے اسلاف کرام کے طریقِ حق پر مستقیم رہنے کی توفیق پاؤں اور اپنی ساری زندگی اسی راہ کی کوچہ گردی میں بسر کردوں جس کا نشانِ سفر وہ اپنی یادگار میں چھوڑ گئے ہیں۔ خدمتِ علم وحق کا ایک سرمایہ سعادت ہے جو مجھ تہی دست تک پہنچتا ہے۔ میری محرومی ہے اگر اس کو بچا نہ سکا اور فضل الٰہی کی بخشش ہے اگر اس کی عزت اور نامِ نیک کو آنے والوں کے لیے محفوظ چھوڑ گیا۔

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
معیارِشرف	بزرگی کا پیمانہ
جوہرِ ذاتی	اصلی یا حقیقی ہنر
اَسلاف	بزرگ، پہلے وقتوں کے لوگ
روایاتِ پارینہ	پرانی روایتیں
باطِل	ناحق۔ غلط بےاصل۔جھوٹا
استحقاقِ ذاتی	اصل قابلیت، اصل حق
صحفِ ابراہیمؑ وموسیٰؑ	وہ چھوٹی کتابیں جواللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمائیں
سرگران	ناراض، نشے کا خمار
صالح	پرہیزگار، نیک
اَخلاف	خَلف کی جمع، اولاد، آنے والی نسل
موروثی	پشتینی، باپ دادا کا
اعتراف	اقرار کرنا، مان لینا
تہی دست	مفلس، غریب، خالی ہاتھ

مشقی سوالات

مختصر سوالات:

۱۔ مضمون 'حقیقی عظمت' کے مصنف کا نام بتائیے۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۳۔ فریڈرک اعظم کی قبر پر نیپولین کو کیا چیز ملی؟

مختصر سوالات:

۴۔ فریڈرک اعظم کی تلوار کے متعلق نیپولین اور جنرل کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟

۵۔ مولانا آزاد کے مطابق سچی عظمت کیا ہے؟

۶۔ حضرت بلال حبشیؓ اور حضرت صہیب رومیؓ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات زندگی تحریر کیجیے اور ان کی نثر نگاری کی خوبیوں پر روشنی ڈالیے۔

۸۔ مولانا آزاد کے مضمون 'حقیقی عظمت' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

مولانا وحیدالدین سلیمؔ

مولانا وحیدالدین سلیمؔ ۱۸۶۷ء میں قصبہ پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ان کے والد حاجی سید فریدالدین پانی پت کے مشہور سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے آستانے کے متولّی تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔حفظِ قرآن گھر پر ہی استانی شمس النساء آپا نے کرایا۔والد حاجی فریدالدین کے انتقال کے بعد سلیمؔ کی تعلیم وتربیت ان کے والد کے کرم فرما اور بزرگ مولانا سید غوث علی شاہ کی زیرنگرانی ہوئی۔مولانا کو بچپن سے ہی فارسی کا شوق تھا۔نہایت ذہین تھے۔محض ۱۴؍برس کی عمر میں مولانا نے مولانا سید غوث علی شاہ کی مدح میں فارسی میں ایک قصیدہ لکھا جو ایک سوایک اشعار پر مشتمل تھا اور اسے مولانا اور دیگر عوام کے سامنے پڑھا۔جسے سن کر عوام اور خود مولانا محوِ حیرت ہوگئے۔

پانی پت میں مڈل درجہ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا لاہور تشریف لے گئے۔جہاں آپ نے عربی ادب کی تعلیم مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کی،تفسیر بھی انھیں سے پڑھی۔فقہ، حدیث،منطق اور فلسفہ کی تعلیم مولانا عبدالاحد ٹونکی سے حاصل کی۔تلاشِ معاش کے لیے ریاست بہاولپور (پاکستان) گئے جہاں محکمۂ تعلیم ،ریاست بہاولپور میں ملازت کی۔کچھ عرصہ بعد رامپور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر مامور ہوئے۔لیکن مرضِ تَشَنُّج (اینٹھن کی بیماری) کی وجہ سے تقریباً چھ سال تک مسلسل بستر پر ہی رہے۔صحت یابی کے بعد مولانا نے جالندھر کے ایک مشہور حکیم سے طِبِّ یونانی کا فن حاصل کیا اور پانی پت میں مطب (دواخانہ) شروع کیا۔

سرسیّد نے مولانا کی قابلیت اور جوہر کو پہچانا اور انھیں اپنے پاس بلا لیا۔مولانا ایک عرصہ تک سرسیّد کے لٹریری سکریٹری رہے۔مولانا سرسیّد کے 'علی گڑھ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' رسالوں کے لیے بھی مواد فراہم کرتے تھے۔سرسیّد کے انتقال کے بعد مولانا نے رسالہ ''معارف'' نکالا اور پھر کئی برس تک ''علی گڑھ گزٹ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔اس کے بعد لکھنؤ سے نکلنے والے ''مسلم گزٹ'' کے بھی ایڈیٹر بنے۔

سلیم عمر کے آخری دور میں محکمۂ دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے اور عثمانیہ یونی ورسٹی کے لیے تیّار ہونے والی کتب کے تراجم کا کام سنبھالا۔عثمانیہ یونی ورسٹی کھلنے پر مولانا شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔محض چار سال میں ہی اپنی لیاقت اور صلاحیت کی وجہ سے انھیں پروفیسر بنا دیا گیا۔اور آخری عمر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔۱۹۲۸ء میں حیدر آباد میں آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا اردو، عربی اور فارسی کے جیّد عالم اور فارسی و اردو کے اچھے شاعر بھی تھے۔وہ مغربی علوم سے بھی بخوبی واقف تھے۔مولانا حالؔی کی ان پر خاص نگاہ تھی۔مولانا نے بچپن سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور ابتدا میں روایتی انداز میں غزلیں کہتے تھے۔لیکن لاہور میں رہتے ہوئے ان پر حالؔی کا اثر پڑا اور انھوں نے قومی نظمیں لکھیں۔

سلیؔم نے نظم نگاری کے ساتھ ہی درس و تدریس اور نثر پر زیادہ توجہ دی۔ان کی نثر نہایت سادہ سلیس اور معنی خیز خیالات پر مبنی ہوتی تھی۔وہ عربی اور فارسی کے دقیق الفاظ سے اجتناب کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور ہمیشہ غیر مذہب کے بزرگوں اور ان کی تاریخ و ادب کی عظمت و احترام کرتے تھے۔سرسیّد کی صحبت کی وجہ سے بھی ان کی نثر نگاری پر اثر پڑا۔اپنے خیالات نہایت واضح اور آسان زبان میں ظاہر کرتے تھے۔اپنی تحریر و تقریر میں ہندی کے میٹھے اور سریلے الفاظ نہایت بے تکلّفی سے استعمال کرتے تھے۔ان کی نگاہ وسیع اور علم ٹھوس تھا۔ان کے یادگار مضامین میں ''تلسی داس کی

شاعری‘‘ اور’’عربوں کی شاعری‘‘ بہت مشہور ہیں۔ان کی مشہور کتاب’’وضعِ اصطلاحات‘‘ ان کے اعلیٰ تحقیقی مرتبہ وعلمی کمال کا ثبوت ہے۔ زیرِنظر مضمون’خطاب بہ طلبا‘ میں سلیمؔ نے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے انھیں دنیا اوراس کی حقیقت اور یہاں درپیش دشواریوں اوران کا سامنا کر کے منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے کوشش وعمل کرنے کی ترغیب دی ہے۔

وحیدالدین سلیم

خطاب بہ طلبا

عزیز نوجوانو!

کتابوں کی دنیا ایک خیالی دنیا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اس دنیا سے نکل کر اصلی دنیا میں قدم رکھنا چاہیے۔ جب وہ اصلی دنیا میں جو خیالی دنیا نہیں ہے بلکہ ایک زندہ دنیا ہے قدم رکھیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے چاروں طرف خطرات ہیں، مشکلات ہیں۔ وہ ان خطرات ومشکلات کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھیں تو ان کے لیے اس زندہ دنیا میں کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ اگر ان کو زندہ رہنا ہے اگر ان کو کارآمد اور مفید شہری بننا ہے تو وہ پھر کمر باندھ لیں کہ اپنے گردوپیش کے خطرات ومشکلات کے پہاڑوں کو کاٹ ڈالیں گے اور ان کے درمیان چلنے کو ایک کشادہ رستہ بنائیں گے۔ ورنہ پھر ان کو انھیں کتابوں کے قبرستان میں جن کو وہ پڑھتے رہے ہیں دفن ہوجانا چاہیے اور ترقی اور کامیابی کا کبھی نام نہ لینا چاہیے۔

کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس روشن خیال ایڈیٹر کی تقریر پر غور کرنا چاہیے۔ کتابوں کو پڑھ کر گزشتہ نامور انسانوں کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں کہ ان کو خدا نے غیر معمولی قوتیں عطا کی تھیں یا ان کے زمانے کے لوگ ایسے شائستہ اور شریف تھے جن سے اپنی کامیابی اور ترقی کے رستے میں کسی خلل کا اندیشہ ان کو پیدا نہ ہوا۔ حاشا وکلّا! جس طرح ہمارا زمانہ خطرات ومشکلات سے لبریز ہے، جس طرح مخالف طاقتیں ہمیں اب ہر طرف دباؤ ڈالتی نظر آتی تھیں، جس طرح قدم قدم پر زحمتوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہمیں اب کرنا پڑتا ہے، جس طرح تعصب وحسد کے دیو ہمارے سامنے سینہ تانے اب کھڑے ہیں، یہی حال پہلے بھی تھا مگر جن لوگوں نے ترقی اور کامیابی حاصل کی اور شہرت اور ناموری کی بلندی پر پہنچے انھوں نے لاجب ارادے اور اٹل ہمت سے کام لیا۔ وہ مصیبتوں کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھے۔ ان

کے عزمِ راسخ کے سامنے پہاڑ پانی ہوکر بہہ گئے۔ مشکلات کی سنگین چٹانیں پاش پاش ہوگئیں۔ ان کو بارہا ناکامیاں ہوئیں مگر مایوسی ان کے تیور پر شکن نہ ڈال سکی۔ انھوں نے بہت دفعہ شکست کھائی مگر وہ ہر دفعہ پسپا ہوکر آگے بڑھے اور آخر کار اس منزل پر پہنچ گئے جہاں ان کو پہنچنا مطلوب تھا۔ دنیا میں جس طرح خودغرض، حاسد متعصب اور عیاّر آج موجود ہیں، پہلے بھی تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے درمیان وہ ناموران بھی گھِرے ہوئے تھے مگر جس دُھن میں وہ محو تھے اس سے کوئی چیز ان کو نہ ہٹا سکی۔ جس نشہ میں وہ مست تھے اس کو کوئی ترشی نہ اتار سکی۔

ہمارے کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تعلیم ختم کرنے کے بعد اصلی اور زندہ دنیا میں داخل ہونا ہے۔ اگر وہ اس کے لیے تیاری نہ کریں تو پھر ان کا ناکام ہونا اور شکست پانا ضروری ہے۔ اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہے وہ کالجوں کے احاطے میں بتائے نہیں جاتے۔ موجودہ طرزِ تعلیم سے وہ اخلاقی تربیت نہیں ہوسکتی جو ان کو اصلی اور زندہ دنیا میں کامیاب کرے۔ یہ تربیت ہوشیاری کے ساتھ خود اصلی اور زندہ دنیا ہی میں داخل ہونے سے مل سکتی ہے۔ دانایانِ فرنگ نے ایسی انجمنیں قایم کی ہیں جن کے ارکان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فیس لے کر گھر بیٹھے ایسے اصولوں کی تعلیم دیتے اور اصولوں کی مشق کراتے ہیں جن کے سبب وہ کامیاب ہوں۔ مگر وہ تعلیم بے کار ہے۔ اگر سبق لینے والے طلبہ سوسائٹی میں ان اصولوں کی مشق عملی نہ کریں، یہ اصول کوئی انوکھے اور نرالے اصول نہیں۔ دنیا میں جن لوگوں نے کامیابی اور ترقی حاصل کی ہے ان کو پیش آنے والے خطرات اور مشکلات نے یہی اصول بتائے تھے۔ اگر وہ زحمتوں اور مصیبتوں میں پڑ کر ان اصولوں کی عملی مشق نہ کرتے تو منزلِ مقصود تک کبھی پہنچ نہیں سکتے تھے۔ غور کرنے والوں نے کامیاب اور ترقی یافتہ انسانوں کی زندگیاں پیشِ نظر رکھ کر چند اصول مرتّب کر لیے ہیں اور ان کو وہ تمام دنیا میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر نوجوان جو زندہ دنیا میں قدم رکھتا ہے اور کوئی مطمحِ نظر اس کے سامنے ہے ان اصولوں کی مشق و مزاولت

کرے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ میرے نزدیک ہر سوچنے والا دماغ ان اصولوں تک ضرور پہنچے گا اور ہر غور کرنے والا دل ان کی صداقت کومحسوس کرے گا۔ یہ ہر انسان کے دل کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ سمجھ کر فراموش نہ کیے جائیں، ضرورت ہے کہ ان پر یقین کیا جائے۔ ضرورت ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔

جو پیغام میں تعلیم یافتہ نوجوانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس میں اِنھیں فطری اور ابدی اصولوں کی روح ہے جو ایشیا کے ہر مفکّر کے قلب میں اسی طرح موجزن ہیں جس طرح یورپ کا ایک ہوش مند اور مفکر انسان اس کومحسوس کرتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر نوجوان کو اپنے دل میں کوئی عمدہ خواہش پیدا کرنی چاہیے۔ خواہش کا ماخذ کوئی ایسا فائدہ ہے جو ہونا چاہیے مگر ہے نہیں۔ یعنی فائدہ غیر موجود کے احساس کا نام خواہش ہے، مسرت وانبساط کی تلاش کا نام خواہش ہے۔ یہ ایک محرّک ہے جو ہمیں فعل یا ترک فعل پر مجبور کرتا ہے۔ یہ محرک ہماری تمام قوتوں کو اکساتا ہے اور ہم میں کام کرنے کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ جو جذبات اس عمدہ خواہش کی تکمیل میں موجزن ہوان کو مرنے دینا نہیں چاہیے، اپنے تمام دل ودماغ کو اس میں منہمک کر دینا چاہیے۔ اپنی خواہش کو اس قدر بار بار سوچنا اور دل میں لانا چاہیے کہ کوئی چیز اس کے سوا کاشانۂ دل میں نہ رہے۔ ایک بڑے نامور انسان کا قول ہے کہ جیسا سوچو گے ویسا کرو گے اور جیسا کرو گے ویسا بنو گے اور جیسا بنو گے ویسے نتیجے حاصل کرو گے۔ ایک عالی خیال انسان کی نصیحت ہے کہ ''اپنی خواہشوں اور ان کے جذبات کو پژ مردہ نہ ہونے دو ان کا احترام کرو، ان کو پیش گوئیاں سمجھو جو پوری ہونے کے لیے تیار ہیں۔''

خواہش ایک زبردست محرّک ہے جو ارادے میں تموّج پیدا کرتا ہے۔ پُر جوش خواہش اور مصمّم ارادہ وہ اوصاف ہیں جو ناممکن کوممکن کر دکھاتے ہیں۔ جوش کیا ہے؟ ایک متعدّی بخار ہے جو اپنی گرم اور

بے قرار لہروں کا جال اپنے گردوپیش پھیلا دیتا ہے اور خود بیچ میں بیٹھ جاتا ہے اس لیے کہ تمنا کو مسخّر کرے اور مراد کو شکار کرے۔ جب الہامِ ربّانی ہماری ذاتی دلچسپیوں اور ہمارے فطری رجحانوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیتا ہے، اسی حالت کا نام جوش ہے۔ یہ قوت ہر کس و ناکس کے اندر ودیعت کی گئی ہے مگر بہت کم ہیں جو اس کے اظہار کی خواہش کرتے ہیں۔ جوش ایک قسم کی بھاپ ہے جو ہماری دماغی مشین کو چلاتی اور ہمیں کامیابی اور کامرانی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ مجنونانہ جوش شخصیت کی جان اور کامیابی کی روح رواں ہے۔ پرجوش خواہش کے ساتھ مصمّم ارادے کی ضرورت ہے۔ ارادہ کارخانۂ دنیا میں ایک عظیم الشاّن قوت ہے۔ انسان ایک برقی ٹریم ہے، دماغ برقی چھڑی ہے۔ ارادہ برقی تاروں کا ایک سلسلہ ہے جو اس کے اوپر پھیلا پڑا ہے۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ برقی چھڑی سے ارادے کے تاروں کو چھولے، حرکت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ پرزور خواہش اور اٹل ارادے جس انسان کے اندر موجود ہیں وہ عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان کے آگے آخر کار سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ جوان کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتا بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور تُرکی بہ تُرکی جواب دیتا ہے۔

عزیز نوجوانوں! یاد رکھو کہ ایسا انسان دنیا کے ناگوار واقعات سے نہیں گھبراتا وہ ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو بے پروائی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ یقین کرتا ہے کہ جو امور بظاہر ناگوار اور ناقابلِ برداشت معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقت میں دیگر خوش آیند امور کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

ایک بڑے تجربہ کار حکیم کا قول ہے کہ ''مصیبتیں مصیبتیں نہیں ہیں۔ وہ ایک امتحان ہیں جس کا نتیجہ کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی مگر کامیاب صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ان سے مغلوب نہیں ہوتے۔'' ایک اور دانشمند مصنّف لکھتا ہے کہ ''زور شور کی بارش ایک نعمت ہے جس پر کائنات کی زندگی کا مدار ہے۔ اگرچہ ایک صاحبزادے کی قیمتی اور پرتکلف پوشاک اس کے چھینٹوں سے بھیگ جائے، کیا اس

سے بارش کے فوائد میں کمی واقع ہوگی۔ ہرگز نہیں۔اسی طرح مصائب وآلام خدا کی نعمتیں ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان کے ظاہری جوش وخروش سے ہم ناک بھوں نہ چڑھائیں۔''

علمی اخلاق کے ماہرین نے ہدایت کی ہے کہ مصیبت کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھنا چاہیے اور اپنے مطمحِ نظر پر جو یقین ہے اس میں کسی طرح کا تزلزل نہیں آنا چاہیے۔یقین رکھنا چاہیے کہ مصیبت کا بادل چھٹ جانے کے بعد کامیابی کی روشنی ضرور جلوہ گر ہوگی۔کسی مصیبت یا کسی تکلیف کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے کہ شکایت اور شکست دونوں لفظوں کے ایک معنی ہیں۔یعنی اگر شکایت کرتے ہو تو یقین کرلو کہ تم اپنے پیشِ نظر میدان سے ہٹ گئے اور تم نے اپنی شکست مان لی۔شکایت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تم جو اپنے مقصد پر یقین رکھتے تھے اب اس یقین میں خلل آ گیا۔حالانکہ یقین ہی وہ چیز ہے جس میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔کارپردازانِ قضا وقدر نے قلوبِ انسانی میں ایک زندہ چنگاری مخفی رکھی ہے جو خواہش کی تحریک سے مشتعل ہوتی ہے۔اگر اس کی طرف سے غفلت کی جائے تو وہ چنگاری کجلاتی اور بالآخر بجھ جاتی ہے۔اس چنگاری کے زندہ رکھنے کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ یقین واعتقاد ہے۔ارادہ اس کا ایندھن ہے جب یہ غذا اس کو ملتی ہے تو اس کی ترقی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں رہتی۔مزاحمت کی لوہالاٹ دیواریں اور رکاوٹ کی سنگلاخ چٹانیں واعتقاد کے مقابلے میں پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ہمت واستقلال اسی حالت کا نام ہے۔

اگر منزلِ مقصود پر پہنچنے کی آرزو ہے تو اس سے پہلے ہر نوجوان کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں کوئی شے مفت نہیں ملتی۔باقاعدہ اور جاں کاہ محنت کے بغیر کامیابی ایک خواب ہے جس کی تعبیر ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔پس ضروری ہے کہ ہر نوجوان اپنے اوقات کو کام میں مشغول رکھے،بے کاری میں زندگی بسر نہ کرے۔اس کو یقین کرنا چاہیے کہ کام زندگی ہے اور بے کاری موت ہے۔سکون اور افسردگی حرام ہے۔نچلا بیٹھنا خطرناک ہے۔ہر نوجوان کو اپنے پیش نظر مقصد کے لیے ہمیشہ ہمت اور کوشش میں مشغول

رہنا چاہیے۔ یہ کوشش مجنونوں کی سی ہو۔ گذشتہ زمانے میں بھی جو نامور انسان اپنے مقصد کے لیے ایک خاص دھن میں مشغول رہے ہیں ان کو دنیا نے مجنوں کہا ہے اور مجنوں سمجھا ہے مگر ایک انشا پرداز لکھتا ہے کہ ''ایسے ہی مجنونوں کی ضرورت دنیا کو ہے۔'' تمدن کی عظیم الشّان عمارت کی بنیاد انھیں مجنونوں نے اٹھائی تھی۔ اگر یہ مجنوں نہ ہوتے تو دنیا ترقی کی منزل میں ایک قدم آگے نہ بڑھتی ایسے ایک مجنوں کی دھن پر ہزاروں ہوشیار اور عقل مندوں کی عقل وحکمت قربان کر دینی چاہیے۔ قافلے کے قافلے گہری اور میٹھی نیند میں پڑے ہوتے ہیں۔ مگر یہ مجنوں اس وقت بھی تگ ودو میں سرگرم نظر آتے ہیں ان کو آوازِ جرس کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کی آواز ہی ان کو ہر وقت جگاتی اور آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ وہ رستے کے خطرات سے نہیں گھبراتے بلکہ خطرات کو خود طلب کرتے ہیں تاکہ ان میں پڑ کر نفس کی تربیت ہو، وہ مشکلات سے خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ مشکلات کو خود دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور ان کو زندگی اور گرمجوشی کا سبق دیں۔ ناکامیوں کا وسوسہ ان کے دلوں میں نہیں آتا۔ اگر ناکامیاں ان کو پیش آتی ہیں تو وہ ان سے لڑتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی دھن میں موت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ ذوقِ طلب میں وہ برابر آگے بڑھتے ہیں اور اپنے سفر سے نہیں اکتاتے۔ جوں جوں چشمۂ زندگی کے قریب پہنچتے ہیں ان کی پیاس تیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ غم اور مایوسی سے کبھی دوچار نہیں ہوتے۔ ان کی نظر امید کے ستارے پر رہتی ہے جو ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے افق پر چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔

عزیز نوجوانو! یاد رکھو کہ ہماری خوشی اور ناخوشی بلکہ خود ہماری ہستی خیال کے تابع ہے۔ ہم کیا ہیں؟ سر سے پاؤں تک خیال کے پتلے ہیں۔ کائنات میں خیال سب سے بڑی قوت ہے اور جس چیز کا نام عمل ہے وہ اس کا پیرو ہے جو سایہ کی طرح اس کے جلو میں چلنا اپنے لیے باعث فخر جانتا ہے۔ ہر خیال اپنے موافق خیال کو اپنی طرف کھینچتا ہے ہمت افزا خیالات میں کامیابی کا راز مضمر ہے اور ہمّت شکن خیالات نامرادی اور ناکامی کی ذمّہ دار ہیں۔

گارفیلڈ کا قول ہے ''اس مغالطہ میں نہ رہو کہ قسمت تمہاری تلاش کر رہی ہے۔ سچ یہ کہ تم خود قسمت کی تلاش میں ہو۔ اگر تم وہ تمام شرطیں پوری کر دو جو خوش قسمتی کے لیے ضروری ہیں، پھر قسمت کی دیوی ضرور تم پر مہربان ہوگی۔''

یاد رکھو کہ کامیابی اتّفاقی اور اضطراری نہیں ہے بلکہ قانون کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہے۔ لوگ جس کو محض بخت و اتفاق کہتے ہیں، قوانینِ فطرت کی فہرست میں اس کا کہیں نام نہیں۔ تم جو کچھ ہو کسی نہ کسی قانون کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہو۔ لازم ہے کہ خود اپنی ذات پر بھروسا کرو۔ غیر تمہیں نہ بنا سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ تمہاری کامیابی اور ناکامی کی کنجیاں خود تمہاری جیب میں ہیں۔ اگر تم مسرّت و انبساط کی تلاش میں ہو، اگر تم فارغ البالی اور خوش اقبالی کا سراغ لگا رہے ہو تو یہ سب کچھ تمہارے دل کے اندر موجود ہے، دل کے دروازے پر دستک دو فوراً تمہاری دستک کا جواب ملے گا۔ الہامی صدا بھی یہی ہے کہ ہر آن انسان کی کامیابی اس کی ذات پر ہے۔ ہر انسان جیسی کوشش کرے اس کا ویسا ہی نتیجہ حاصل کرتا ہے۔

اے شریف نوجوانو! جب تم اپنی دھن میں مشغول ہو غم اور خوف کو اپنے پاس نہ آنے دو۔ کسی کو آزار پہنچانے کا خیال دل میں ہرگز نہ لاؤ۔ محبت سے ہر شخص کو یاد کرو عداوت اور حسد کے خوفناک جذبات کو اپنے سے دور رکھو، نیکی سے ہر شخص کے ساتھ پیش آ سکتے ہو، بدی سے کسی کے ساتھ نہیں۔ تمہارے نغمۂ زندگی کے الفاظ حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

''میں اس عالمگیر شعور کا ایک جز ہوں جو روح عالم ہے اس لیے میں زندگی ہوں۔ میں صحت و تندرستی ہوں۔ میں اتحاد و اتفاق ہوں، میں موسیقی ہوں، میں مسرت و انبساط ہوں، میں کامیابی اور خوش نصیبی ہوں، میرا قلب بلند خیالات کا خزانہ ہے اس لیے اغیار کے پست خیالات مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میرے دل میں کسی کی طرف سے کدورت نہیں۔ اس لیے میں نہ تو کسی کو آزار پہنچانا چاہتا ہوں اور

نہ کسی سے خائف ہوں۔ میں ہر شخص کو محبت سے یاد کرتا ہوں ۔ میری خواہش اور مرا یقین دونوں زبردست ہیں اس لیے میں کامیاب ہوں۔ میں اپنی خواہش اپنے ارادے اور اپنے خیالات کا نتیجہ ہوں میرے اعمال و افعال، میری خواہش، میرا ارادہ اور میرے خیالات مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ترقی کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ اگر ہے تو یہ میرا قصور ہے۔''

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

الفاظ	معانی
حاشا وکلّا	خدا نہ کرے، خدا کی پناہ
تعصّب	بے جا حمایت، طرفداری
لاجنب	اٹل، مضبوط
عزمِ راسخ	پکّا ارادہ
تُرشی	کھٹاس، کھٹائی
دانایانِ فرنگ	یورپین دانشمند، مغربی مفکّرین
مُزاولت	روزمرہ مشق، کسی کام کو ہمیشہ کرنا
مُحرِّک	حرکت دینے والا، اکسانے والا
تمَوُّج	لہریں اٹھنا
ودیعت	سپردگی، داخل کی گئی
نشیب وفراز	اُتار چڑھاؤ

جرس	گھنٹا، گھڑیال
برقی ٹریم	بجلی سے چلنے والی گاڑی
کدورت	رنجش، دل کا غبار
آزار	تکلیف، ایذا

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ مضمون 'خطاب بہ طلبا' کے مصنف کا نام بتائیے۔
۲۔ مولانا وحیدالدین سلیم کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۳۔ اس مضمون میں وحیدالدین سلیم نے کس کو مخاطب کیا ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ علمی اخلاق کے ماہرین نے مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے طلبا کو کیا ہدایات کی ہیں؟
۵۔ وحیدالدین سلیم نے خواہش کی کیا تعریف بتائی ہے؟
۶۔ مصیبتوں کے متعلق تجربہ کار حکیم کا کیا قول ہے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ مولانا وحیدالدین سلیم کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کیجیے اور ان کی نثر نگاری پر روشنی بھی ڈالیے۔
۸۔ سلیم کے مضمون، خطاب بہ طلبا' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

طنز و مزاح: ایک تعارف

طنز و مزاح کو عموماً ایک صنفِ ادب سمجھنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طنز و مزاح ادبی صنف نہ ہو کر اسلوب، طرز یا تکنیک کا نام ہے جس کی دیگر شعری و نثری اصناف کی طرح کوئی ہیئت یا ڈھانچا مقرر نہیں ہے۔ طنز اور مزاح کو اکثر ایک مرکب لفظ کے طور پر استعمال کرنے کی روایت بھی پرانی ہے۔ جب کہ یہ دونوں لفظ الگ الگ ہیں اور جن کے معنی، مقصد اور طرز بیان میں بھی معمولی سا فرق ہوتا ہے۔

طنز کے لغوی معنی ''طعنہ'' کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ ادب میں طنز کے لیے لعن طعن، تمسخر، ہجو اور تنقیص جیسے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے 'SATIRE' اور ہندی میں 'x;0' کہا جاتا ہے۔ طنز کا بنیادی مقصد کسی کی دل آزاری، ہنسی اُڑانا یا تکلیف پہنچانا نہ ہو کر اصلاح کرنا ہوتا ہے۔

مزاح کے لغوی معنی ''خوش طبعی'' بتائے گئے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے 'HUMOUR' اور ہندی میں '; gkL' لفظ استعمال ہوتا ہے۔ طنز کی طرح مزاح کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔

طنز و مزاح اگر چہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے الگ الگ ہیں لیکن مقصدی اور افادی طور پر دونوں لازم و ملزوم ہونے کے سبب چولی دامن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طنز اور مزاح مشترک طور پر ہزل، ہجو، تضحیک، نوک جھونک، پھبتی، ضلع جگت، لعن طعن، پیروڈی اور فنٹاسی وغیرہ کے حوالے سے مل جل کر اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ لطیفہ سازی، چٹکلے بازی، چھچھور پن، چھیڑ چھاڑ، ٹھٹھولی، جنسی چٹخارے اور پھکڑ پن کا شمار طنز و مزاح میں نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان میں عریانیت، رکاکت اور ابتذال کے پہلو شامل ہوتے ہیں۔

اردو میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے۔اس کی ابتداء شاعری میں ہوئی۔طنز و مزاح کا دورِ اوّلین ہجونگاری کی صورت وجود میں آیا۔مشہور ہجونگار میر جعفر زٹلی کو طنز و مزاح کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔زٹلی کو بعض مؤرخین اور ناقدین نے باغی،خودسر اور دوسروں کی دل آزاری کرنے والا شاعر قرار دیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ زٹلی کے یہاں طنز کا پہلو خاکہ اڑانے اور تیکھی ضرب لگانے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔

ہجونگاری میں محمد رفیع سوداؔ کا نام بھی اہم ہے۔سوداؔ کے عہد کے لوگ شہر کے کوتوال کے بجائے سوداؔ کے قلم سے ڈرتے تھے۔سوداؔ جب کسی پر بگڑتے تھے تب ہجو کہہ کر اسی کی بخیہ ادھیڑ دیتے تھے۔اس سلسلے میں ان کی مشہور تخلیق ''تضحیکِ روزگار'' کا حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

لکھنؤ میں انشاؔء، مصحفیؔ اور جرأتؔ نے طنز و مزاح کے لیے ہجونگاری اور ریختی گوئی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ان شاعروں میں معاصرانہ چشمکیں ہوا کرتی تھیں جو اکثر معرکہ آرائی کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ان شعرا کے علاوہ سعادت یار خاں رنگیںؔ، جانؔ صاحب اور نازنیںؔ جیسے شاعروں نے بھی ریختی گوئی کو فروغ دے کر طنز و مزاح نگاری کو مالا مال کیا۔

نظیرؔ اکبرآبادی کی منظومات اور ہجویات بھی طنز و مزاح نگاری کا اہم حصہ ہیں۔انھوں نے انسانی کمزوریوں اور خرابیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

مرزا غالبؔ اور ان کے معاصرین کا دور صحت مندانہ طنز و مزاح کے لیے مثالی نمونے پیش کرتا ہے۔غالبؔ کی شاعری اور خطوط میں طنز و مزاح کی چاشنی اپنا منفرد ذائقہ دیتی ہے۔غالبؔ کی گدگدانے والی شوخی و ظرافت اور بذلہ سنجی کے پیش نظر حالیؔ نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔

اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ۱۸۷۷ء میں ''اودھ پنچ'' نامی اخبار کے جاری ہونے سے تقویت ملی۔اس اخبار کے مدیر سجاد حسین نے اردو کے شعرا اور نثر نگاروں سے اس اخبار کے لیے لکھنے کا مطالبہ کیا

تو پنڈت تر بھون ناتھ ہجرؔ، احمد علی شوقؔ ،عبدالغفور شہبازؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ،اور اکبرؔالہ آبادی جیسے اہل قلم کی طنز یہ ومزاحیہ تحریریں نئی آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔ ہجرؔ کی تحریف اور پیروڈی تو شوقؔ کی قہقہہ زار تخلیقات تاریخی اہمیت وحیثیت کی حامل ہیں ۔شہبازؔ نے اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر مذہب، سیاست اور معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات پر بھر پور طنز کیا۔

''لسان العصر'' اکبرؔالہ آبادی اردو طنز ومزاح کی تاریخ میں سب سے الگ اور انفرادی پہچان اور مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مغرب زدہ لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ سرسید کے تعلیمی پروگرام پر انکی حملہ آور نظمیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں ''واعظ اور سید''، ''برق کلیسا''، ''دربارِ دہلی''، ''ایک شکایت'' اور ''لندن میں جا کے کر لیا اک بتِ سیمیں سے عقد'' طنز ومزاح کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اکبرؔ نے اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔

ظریفؔ لکھنوی، علامہ شبلیؔ نعمانی، علامہ اقبالؔ اور ظفرؔ علی خاں کی طنز یہ تخلیقات اردو ادب کا اٹوٹ حصہ ہیں ۔ جوشؔ ملیح آبادی، راجہؔ مہدی علی خاں، ضمیرؔ جعفری، مجیدؔ لاہوری، سید محمد جعفری، مخمورؔ جالندھری وغیرہ نے اردو ادب کو طنز ومزاحیہ تحریروں سے گہر بار کیا۔

شاعری سے قطعہ نظر اردو نثر میں بھی طنز ومزاح کی مستحکم روایت تاریخ ادب اردو کے روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں اردو نثر میں جو طنز یہ ومزاحیہ ادب تخلیق ہوا اس میں محض ٹھٹھولی اور فقرہ بازی ہوا کرتی تھی۔ اردو میں طنز ومزاح کے ابتدائی نقوش داستانوں میں ملتے ہیں۔ ان داستانوں میں ''فسانۂ عجائب'' (رجب علی بیگ سرورؔ) ''طوطا کہانی'' (حیدر بخش حیدریؔ) ''رانی کیتکی کی کہانی'' (انشاؔ) ''نورتن'' (مہجورؔ) ''داستان امیر حمزہ'' اور ''بوستان خیال'' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعے اردو کے نثری ادب کو طنز ومزاح کے سلسلے میں معیار و وقار عطا کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں طنز ومزاح کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں ۔ رتن ناتھ سرشارؔ نے

''فسانۂ آزاد'' کے ذریعہ لطافت، حاضر جوابی، پھبتی اور بذلہ سنجی کو فروغ دیا۔ سجاد حسین نے کالم نگاری کے ذریعے طنز و مزاح کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے معاصرین میں مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی کسمنڈی اور عمر آزاد، دلاور فگار اور چراغ علی حسرت وغیرہ کی تحریریں ظرافت نگاری میں خاص مقام رکھتی ہیں۔

اردو ادب میں ایک ایسا عبوری دور بھی آیا جب نثر نگاروں نے طنز و مزاح کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ اس عہد کے اہلِ قلم میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ظرافت نگاری کو معراجِ کمال عطا کی۔ ان کی تحریر کردہ ''نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی، کچھ میری زبانی'' اور ''مضامینِ فرحت'' اس سلسلے کی مضبوط کڑیاں ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ''چمکی''، ''شریر بیوی''، ''کولتار'' اور ''خانم'' جیسی تحریریں پیش کیں۔ ملّا رموزی جنھیں ''گلابی اردو'' کا موجد کہا جاتا ہے، نے طنز و ظرافت کو فطری انداز بخش کر ادبِ لطیف کو نیا موڑ دیا۔ پطرس بخاری کے مزاحیہ مضامین اپنے عہد کی بے راہ روی پر گہرا طنز کرتے ہیں، اس ذیل میں ''مضامین پطرس'' اپنی مثال آپ ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ''مضامینِ رشید''، ''آشفتہ بیانی میری'' اور ''طنزیات و مضحکات'' وغیرہ میں مزاح نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ شوکت تھانوی کا افسانہ ''سودیشی ریل'' ان کی شہرت کا وسیلہ بنا۔ ''موجِ شبنم''، ''بحرِ تبسم''، ''طوفانِ تبسم''، ''کارٹون''، ''جوڑ توڑ'' اور ''سسرال'' کے توسّط سے انھوں نے میدانِ طنز و مزاح میں اپنی حاضری درج کرائی۔ کنھیّا لال کپور کا تیز دھار والا طنز سماج اور حالات کے بگڑے ہوئے روپ کی چیر پھاڑ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان مصنّفین کے علاوہ کرشن چندر، فرحت کاکوروی، غلام عبّاس، قدرت اللہ شہاب، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، ابنِ انشا، کرنل محمد خاں، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، نظیر صدیقی، غلام جیلانی اور مجتبیٰ حسین وغیرہ طنز و مزاح نگاروں نے اردو طنز و مزاح نگاری کی تاریخ کو مضبوطی اور استحکام عطا کیا۔

پطرس بخاری

پطرس بخاری کا اصل نام سیّد احمد شاہ بخاری تھا، لیکن وہ پطرس بخاری کے قلمی نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ پطرس کی ولادت یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو بمقام پیشاور ہوئی۔ ان کے والد سیّد اسداللہ شاہ بخاری نے پطرس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ صرف کی۔ چنانچہ پطرس نے ابتدائی تعلیم پیشاور میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس کالج سے آپ نے انگریزی ادب میں ایم۔اے۔ کا امتحان پاس کیا۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر پطرس مزید تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور کئی برس تک قیام کیا۔ بقول نورالحسن نقوی پطرس بخاری ''یہاں بھی اپنی ذہانت اور ذوقِ مطالعہ کے سبب ہم جماعتوں میں سر بلند رہے۔'' انگلستان سے واپسی پر پطرس گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے پروفیسر اور کچھ دنوں پرنسپل مقرر ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں اقوامِ متحدہ (یو۔این۔او۔) کے شعبۂ اطلاعات میں جنرل سیکریٹری منتخب ہو کر اپنی خدمات انجام دینے لگے۔ پطرس کی انگریزی ادب میں مہارت کے پیشِ نظر کولمبیا یونیورسٹی نے انہیں انگریزی کے پروفیسر کا عہدہ پیش کیا لیکن صد افسوس کہ ۵؍دسمبر ۱۹۵۸ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

پطرس بنیادی طور پر انگریزی کے ادیب تھے لیکن اپنے دوستوں کے اصرار پر انھوں نے اردو میں مزاحیہ افسانے لکھنا شروع کیے۔ پطرس کو اردو میں بہ حیثیت مزاح نگار شہرت ملی۔ ان کی مزاح نگاری

پر مغربی مزاح نگاری، خصوصاً انگریزی ادب کی مزاح نگاری کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ پطرس کے زیادہ تر مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ اور چربہ ہیں۔

پطرس نے اگر چہ بہت کم لکھا لیکن جو لکھا عمدہ لکھا۔ ان کے مضامین کا ایک مختصر مجموعہ 'مضامین پطرس' کے زیرِعنوان شائع ہو کر مشہور ہو چکا ہے۔ ان کے مضامین میں 'لاہور کا جغرافیہ'، 'مرحوم کی یاد میں' 'ایک وصیت کی تعمیل'، 'مرید پور کا پیر' اور 'ہاسٹل میں پڑھنا' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مضامین پطرس کے علاوہ 'تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں'، 'نوعِ انساں کی کہانی'، 'دیہات میں بوائے اسکاؤٹ کا کام' اور 'مصر کی رقّاصہ' بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

مضمون 'سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' میں پطرس نے ایسے نوجوانوں پر بھرپور طنز کیا ہے جو صرف خیالی منصوبے بناتے ہیں۔ ان کی خواہش اور تمنا تو بہت کچھ کرنے کی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتے۔

مصنف نوجوانوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ زندگی صرف خواہشوں اور تمناؤں سے عبارت نہیں۔ کامیابی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے حرکت وعمل بے حد ضروری ہے۔ یہ مضمون سادگی وسلاست، طنز وظرافت، شفتگی وشائستگی، شوخی روانی اور بے ساختگی کے سبب پطرس کے کامیاب اور نمائندہ مضامین میں شمار ہوتا ہے۔

پطرس بخاری

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے' ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپاشنکر جی برہم چاری سے برسبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آئے جاتے ہیں' آپ سحر خیز ہیں' ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیجیے گا۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے بھوکے بیٹھے تھے' دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ہمارے دروازے پر مکے بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر ہم سمجھے کہ خواب ہے' ابھی سے کیا فکر کرنا' جب جاگیں گے لاحول پڑھ لیں گے' لیکن گولہ باری لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئی اور صاحب، جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں' صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب بھی دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا' میرے آباواجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیری آوازیں دیتا ہوں.......اچھا.... اچھا.....تھینک یو......جاگ گیا ہوں........بہت............اچھا...........نوازش..........آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے! یہ سوئے ہوئے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جِلا رہے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں ''قُم'' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ مُردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑی ہی پڑ جاتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغتے تھے؟ یہ ہم سے کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے، اس کا اندازہ بس اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔ اب جو ہم نے کھڑکی اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا

اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں‘ ان میں سے ایک بھی نظر نہ آئی، تو فکر سا ہو گیا کہ آج سورج گرہن نہ ہو! سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی: لالہ جی!..........لالہ جی! جواب آیا ''ہوں''

میں نے کہا: ''آج کیا بات ہے کہ اندھیرا اندھیرا سا ہے۔''

کہنے لگے: ''تو اور کیا تین ہی بجے سے سورج نکل آئے۔''

تین بجے کا نام سن کر ہوش اڑ گئے‘ چونک کر پوچھا: ''کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟'' کہنے لگے: تین.......تو......نہیں........کچھ.............سات...ساڑھے سات منٹ اوپر تین ہیں۔''

میں نے کہا: ''ارے کمبخت‘ خدائی فوج دار‘ بدتمیز کہیں کے! میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا‘ یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو آج دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیرزادے ہیں کہ کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔''

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیر باد کہہ دوں‘ مگر پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکا تو کوئی ہم نے لے نہیں رکھا ہے‘ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح دس بجے اٹھے‘ بارہ بجے تک منھ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے‘ شام کا رُومان انگیز وقت، ہَوا بھی نہایت لطیف تھی‘ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی‘ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ اتنے میں ایک پڑوسی کی آواز آئی: ''مسٹر!''

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے‘ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا ''آپ گا رہے ہیں؟'' زور ''آپ'' پر۔

میں نے کہا: ''اجی میں کس لائق ہوں، لیکن خیر فرمایئے؟''

بولے ''ذرا..........وہ.........میں ڈسٹرب ہوتا ہوں......''

بس صاحب موسیقیت کی روح ہم میں فوراً مرگئی، دل نے کہا ''او نابکار انسان! دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔''

صاحب! خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ''خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔''

آنسو پونچھے اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت پیس لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھالیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد سبھی قسم کی کتابوں کا انبار پڑا تھا، اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علاحدہ رکھ دیا، چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ کھڑا کر دیا، ایک نوٹ پیپر پر کتاب کے صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر منقسم کیا، ساڑھے پانچ سو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر ملامت کی۔ آخرِ کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے تو لغو بات ہے، البتہ پانچ چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی، ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہے تو جلدی ہی سونا چاہیے۔ کھانا باہر ہی کھا آئے تھے، بستر ے میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں۔ یوں تو ہماری قوتِ ارادی کافی

زبردست ہے،جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی کیا حرج ہے، ڈرتے ڈرتے آواز دی: ''لالہ جی!''

انہوں نے پتھر کھینچ مارا: ''یس!''

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔تتلا کے درخواست کی کہ ''لالہ جی! صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں، کل ذرا مجھے چھ بجے، یعنی جس وقت چھ بجیں......

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: ''جب چھ بج چکیں.......سنا آپ نے؟''

چُپ۔

لالہ جی!''

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: ''سن لیا چھ بجے جگا دوں گا۔''

ہم نے کہا: ''ب، ب، ب، اچھا، یہ بات ہے۔''

''توبہ، خدا کسی کو محتاج نہ کرے!

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں، اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا، ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو ابھی جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ہی ایک دو منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے اس صورت میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں ذرا اختلاف ہے۔ بہر حال اس کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں، پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا اور پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پہلے

دیباچے کہ طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی اور پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا' یا شاید سر کو اس میں لپیٹ لیا' شاید کھانسا' کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ یہ یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے' یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے، جس میں نہ آپ ماہر نہ ہم۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو' یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں! لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب! شرافت ملاحظہ ہو' محض اس شُبہے کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا' مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں' ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو' حد درجہ کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ آج بھی اور دنوں کی طرف دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی ! صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے' جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجب چیز پیدا کی ہے' یعنی اگر صبح کے بجائے شام ہو جایا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا!''

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی دادیوں دی کہ آپ پوچھنے لگے: ''تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟''

میں نے کہا: ''ہاں ہاں' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک۔''

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ رکھ دیں' کرسی کو چارپائی کے نزدیک سرکا لیا' اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا' کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے' دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا' تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک ارادہ کر کے سو گئے۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی' نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک

کھڑکی میں سے ان کو ''گڈ مارنگ'' کہا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہوکر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے' دل سے کہا کہ ''دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے' ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' دل نے کہا: ''اور نہیں تو کیا 'تمہارے یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا: ''سچ کہتے ہو یار! یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی مجال کیا ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت لاہور میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا اور مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے' اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار اور سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔''

ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے....... ''خوب' تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں' بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے' ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بے چارا یہی کہتے کہتے مر گیا' مگر ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ (لحاف کانوں پر سرک آیا.......) تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں..... بہت پہلے..... کیا بات ہے؟ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے.......(لحاف سر پر)....... بات یہ ہے کہ تہذیبِ جدید ہماری تمام اعلیٰ قدروں کی بیخ کنی کر رہی ہے' عیش پسندی روز برز بڑھتی جاتی ہے...........(آنکھیں بند).........تو ابھی چھ بجے ہیں' گویا تین گھنٹے متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے' سوال صرف یہ ہے کہ پہلے

کون سی کتاب پڑھیں، شیکسپیئر یا ورڈز ورتھ؟''میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا'اس کی عظیم الشّان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ہے!''
پھر خیال آیا کے دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں۔اس کے اوراق میں فطرت کو سکون واطمینان میسر ہوگا اور دل ودماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے.......لیکن شیکسپیئر......نہیں ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا.......مگر شیکسپیئر ....ہیملٹ.......لیکن ورڈز ورتھ ....لیڈی میکبتھ ....دیوانگی..........سبزہ زار............
بادِ بہاری.....صیدِ ہوس.....کشمیر..........میں آفت کا پرکالہ ہوں..........''

یہ معما اب فلسفے ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے باہر سر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے'اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے۔

کالج ہال میں لالہ جی ملے' کہنے لگے:''مسٹر! صبح میں نے آپ کو آواز دی تھی آپ نے کوئی جواب نہ دیا؟''

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا:''اوہو لالہ جی! یاد نہیں میں نے آپ کو گڈ مارنگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔''

بولے:''وہ تو ٹھیک ہے'لیکن بعد میں.....اس کے بعد......کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی' آپ بولے ہی نہیں۔''

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا' گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائی اور غور وفکر میں مصروف ہو گئے۔ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔پھر یکا یک ایک مجوبانہ انداز سے مسکرا کر کہا:''ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔''میں اس وقت.....اے.....نماز پڑھ رہا تھا۔''لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد واتقا کی مسکینی میں سر نیچے ڈالے کمرے کی

طرف چلے آئے۔

اب یہ ہمارا روز مرہ کا معمول ہوگیا۔ جاگنا نمبر ایک چھے بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرقِ ناز محوِ بالش کم خواب ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھول کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں۔ اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی گا رہی ہو۔ ''تم جاگو موہن پیارے۔'' خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم کو اور بھی درخشندہ کر دے اور ''سانوری صورت توری من کو بھائی'' کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے مسٹر مسٹر کی آواز اور دروازے کی دنا دن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں دیگچوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلّیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سرتال کی کس قدر گنجائش ہے۔

جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں　　　موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

الفاظ	معانی
شعبۂ اطّلاعات	اطّلاعات کا محکمہ، انفارمیشن کا ڈپارٹمنٹ
سر بلند	اعلیٰ مرتبہ، سرفراز، ممتاز
اصرار	ضد، تاکید
منصوبے بنانا یا باندھنا	محاورہ، ارادہ کرنا، ٹھاننا، کسی بات کو دل میں پختہ کرنا
شامت آنا	برے دن آنا، مصیبت آنا
بر سبیل	بہ طور
تذکرہ	ذکر، چرچہ، یادگار، بیان
لفظوں کا بھوکا ہونا	کہتے ہی فوراً کام کرنا
مکے بازی (محاورہ)	مکے سے مارنا، گھونسا مارنا، دِگ جڑنا
بیداری	ہوشیاری، جاگتے ہوئے
قائل	غلطی تسلیم کرنا، کسی کو ماہرِ فن ماننا
آباء واجداد	باپ دادا، مورث
قسمتِ خوابیدہ	سوئی ہوئی تقدیر
نوازش	کرم، مہربانی، لطف، عنایت
آنجناب	جناب والا، اعلیٰ قدر، مخاطب کو بجائے آپ کے تعظیماً آنجناب کہتے ہیں

آفت کا سامنا کرنا (محاورہ) مصیبت آنا، قہر نازل ہونا، صدمہ پہنچنا

اہل ذوق	ذوق وشوق رکھنے والے لوگ
ہوش گم ہونا (محاورہ)	ہوش اڑنا
منظورِ نظر	عزیز، پیارا، محبوب، وہ شخص جس پر کسی کی عنایت ہو
عدم تشدّد	بے توجہی، بے پرواہی، اہنسا
نوع انساں	بشر، انسان کی اولاد
اصلاح	صحت، درستی، نظر ثانی، تصیح
حسب معمول	دستور کے مطابق، جو عمل روزانہ ہو
جوشِ شباب	جوانی کا جوش
ارمان انگیز	حسرت مند، آرزوؤں اور حسرتوں سے پُر
نہایت لطیف	بے انتہا پاک صاف
موسیقیت	جس میں لے اور سنگیت شامل ہو
آستین چڑھانا (محاورہ)	کام کے لیے مستعد ہونا، لڑنے کو تیار ہونا
نابکار	نکما، نالائق، بے کار
مطالعہ	غور، توجہ اور دھیان سے پڑھنا
سرخ	لال
سبز	ہرا
زرد	پیلا
تقطیع	کتاب کا سائز

اضطراب	بے قراری، بے چینی، بے تابی
کمخوابی	کم سونا، نیند نہ آنے کا مرض
طبی پہلو	حکمت اور علاج کی رو سے
ملامت	ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکی، دھتکار
معقول	مناسب، واجب، بجا، درست
ہم خرما و ہم ثواب (کہاوت اور مثل)	وہ کام جس میں لذت بھی ہو اور جو کار خیز بھی ہو، وہ کام جس میں دوہرا فائدہ ہو
قوتِ ارادی	ارادے کی پختگی، ارادے کا پکا ہونا گزارش
بحث طلب	حجت، دلیل، سوال و جواب
سہم جانا (محاورہ)	ڈر جانا، دم بخود ہو جانا
گولہ باری کرنا (محاورہ)	توپ کے گولے پھینکنا
نفسیات	نفسِ انسانی سے متعلق بات
مسئلہ	معاملے کی پیچیدگی، سوال، دینی بات
شبہہ	شک، گمان، وہم
ضمیر	دل، قلب
طمانیت	اطمینان، تسلی
جادو بیانی	جس کی بات، تقریر یا کلام میں تاثیر ہو
خندہ پیشانی کے ساتھ	ہنستے ہوئے، خوش مزاجی کے ساتھ، شگفتہ ہو کر
مطمئن	بے فکر، آسودہ، اطمینان پانے والا

اولوالعزمی	پکا ارادہ، حوصلہ مندی، بلند ہمتی
اوسان خطا ہونا	حواس بجا نہ رہنا، حواس جاتے رہنا
کسالت	سستی، کاہلی، کام چوری
خلل انداز	خلل ڈالنے والا، بیجا مداخلت کرنے والا
مزے اڑانا (محاورہ)	لطف حاصل کرنا، عیش اڑانا
دنیاومافیہا	دنیا اور جو کچھ اس میں ہے
شگفتہ طبعی	خوش مزاج، ہنس مکھ
برخوردار	اقبال مند، صاحب نصیب، بیٹا، فرزند
سعادت امار	نیک بخت، فرماں بردار، خدمت گزار
مقدم	اعلیٰ، اونچا، معزز، برتر
روز بروز	آئے دن، ہر دن، پے در پے
الحاد	سیدھے راستے سے کترا جانا، حق سے پھر جانا
مستعد	آمادہ، تیار، موجود، کمر بستہ
قطعی	واقعی، یقینی، کامل
عظیم الشان	بڑی شان وشوکت والا، بہت بڑا
تصانیف	تصنیف کی جمع، لکھی ہوئی کتابیں
لطف اندوز	جس میں لذت یا مزہ ہو
معمہ	مخفی، پوشیدہ، مبہم، پہیلی
مابعدالطبیعات	الہیات، فوق الفطرت

قہقہہ لگانا	زور سے ہنسنا، ٹھٹھا مار کر ہنسنا
غور و فکر	خوب سوچ سمجھ کر توجہ اور دھیان کے ساتھ
مصروف	مشغول، کام میں لگا ہوا
تعمق	غور کرنا، گہرائی، باریک بینی
یکا یک	اچانک، ناگہاں، دفعتہً
مرعوب	رعب میں آیا ہوا، ڈرا ہوا
زہد و اتقا	پرہیزگاری یا پارسائی، خدا کا خوف
معمول	رواج، دستور، قاعدہ، وہ بات جو روزمرہ کی ہو
جہانِ آرزو	خواہش مندی، چاہت اور تمنا کی دنیا
بوئے سحری	صبح صادق نمودار ہونے کا وقت
تحلیل	گھل جانا، ہضم ہو جانا
خوش گوار	خوش ذائقہ، دل پسند
طلسم	جادو، سحر
نگاہِ اشتیاق	شوق، آرزو یا تمنا بھری نگاہ
دل آویز تبسم	دل کو لبھانے والی مسکراہٹ
درخشندہ	چمکتا ہوا، تاباں، نورانی
سامعہ نوازی	اچھی آواز میں سنانا، خوش گلو

مشقی سوالات

مختصرین ترین سوالات:

۱۔ سبق ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' کے مصنف کے پڑوسی کا کیا نام تھا؟

۲۔ مصنف نے اپنے پڑوسی لالہ جی سے برسبیلِ تذکرہ کیا کہا؟

۳۔ پطرس کے مضامین کا مجموعہ کس عنوان سے شائع ہوا؟

مختصر سوالات:

۴۔ پطرس کی تاریخ ولادت اور وفات تحریر کیجیے۔

۵۔ پطرس کے دو مشہور مضامین کے عنوانات لکھئے۔

۶۔ سبق ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' میں مصنف نے کن کن انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ سبق ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' میں استعمال ہونے والے محاروں کا مطلب لکھتے ہوئے انہیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۸۔ پطرس بخاری کی سوانح عمری لکھتے ہوئے ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے؟

قواعد : علمِ بدیع و بیان

کسی بھی زبان کو صحیح طریقے سے پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے لئے جو اصول بنائے گئے ہیں اسے قواعد کہتے ہیں۔ان اصولوں کے ذریعہ صحیح زبان کا بولنا اور لکھنا آ جاتا ہے۔

قواعد کے حصّے: عام طور پر قواعد کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حروف: اس حصّہ میں حروف سے بحث ہوتی ہے۔

(۲) صَرف: اس کے ذریعہ لفظ کی حقیقت اور اس کی مختلف شکلیں معلوم ہوتی ہیں اس کے جاننے سے الفاظ کا صحیح بولنا آ جاتا ہے۔

(۳) نحو: اس سے الفاظ کی حقیقت اور جملوں میں ان کی ترتیب اور موقع محل کے لحاظ سے ان کے مفہوم کی معلومات ہوتی ہے اس کے ذریعہ الفاظ کا صحیح استعمال اور جملوں میں ان کی درست بندش کا سلیقہ آ جاتا ہے۔اسی طرح کلام کی خوبیوں کے علم کو علمِ بدیع اور علمِ بیان کہتے ہیں۔جس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) تشبیہہ : اس صنعت کو کہتے ہیں جہاں ایک یا کئی چیزوں کو دوسری چیزوں سے کسی بات یا خوبی کی وجہ سے مثال دے کر مقابلہ کیا جائے۔ جیسے چاند سا چہرہ۔ یہاں چہرہ کا مقابلہ چاند سے کیا گیا ہے۔اس کے پانچ اجزا ہوتے ہیں۔

(i) مشبہ: وہ شخص یا چیز جس کو تشبیہ دی جائے

(ii) مشبہ بہ: وہ شخص یا چیز جس سے تشبیہ دی جائے۔

(iii) حرف تشبیہ: وہ حرف یا حروف جو تشبیہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہوں۔ جیسے: سا،

جیسا، مانند،نظیر،مثال وغیرہ۔

(iv) وجہ شبہ: وہ صفت جس میں تشبیہ دی گئی ہو۔ جیسے حامد شیر کے مثل ہے۔اس میں حامد مشبہ ہے، شیر مشبہ بہ ہے، مثل حرف تشبیہ ہے، اور بہادری وجہ شبہ ہے۔

میر تقی میرؔ کے اس شعر میں دیکھئے کتنی خوبصورت تشبیہ ہے۔

نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں محبوب کے لب کو گلاب کی پکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔یعنی ''لب'' مشبہ اور'' گلاب کی پنکھڑی'' مشبہ بہ ہے۔تشبیہ کے لئے لازم ہے کہ اس میں مشبہ اور مشبہ بہ ہوں۔

(۲) تلمیح: جہاں کسی آیت قرآنی یا حدیث یا مسئلہ یا تصور کا یا قصّے کی طرف اشارہ ہو، جس کے بغیر بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے۔اس کو تلمیح کہتے ہیں۔مثلاً ؎

واقعات طور سے ملتا ہے ہم کو یہ پتہ
اس کا جلوہ عام بھی ہے اس کا جلوہ خاص بھی

یہاں کوہِ طور کا حوالہ ہے۔ جہاں حضرت موسٰی علیہ السلام نے خدا کی تجلّی دیکھی تھی۔

(۳) **استعارہ**: اس مجاز کو کہتے ہیں جس کے استعمال کرتے وقت حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔مثلاً: بہادر کے لیے شیر کا لفظ استعمال کریں تو یہ استعارہ ہوگا۔

استعارہ میں ارکانِ تشبیہ کے نام:-

(i) مشبہ کی ذات کو مستعار منہ کہتے ہیں۔

(ii) جو لفظ اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہ مستعار کہلاتا ہے۔

(iii) مشبہ کومستعارلہ، کہتے ہیں۔

(iv) وجہِ شبہ جامع کہلاتی ہے، جیسے شیر کا لفظ مرد بہادر کے لیے استعمال کریں۔تو مرد بہادر کی ذات مستعارلہ،لفظ بہادر مستعار، شیر مستعار منہ اور بہادری وجہ جامع ہوگی۔

اقبالؔ کی نظم ''جگنو'' میں استعارہ کا استعمال دیکھیے ۔ ؎

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

یہاں جگنو کو بطور استعارہ چاند کہا ہے۔

استعارہ کی قسمیں بلحاظِ مشبہ اور مشبہ بہ کے حذف و ذکر کے دو ہیں

(i) **استعارہ بالتصر**: وہ معمولی استعارہ ہے جس میں (مشبہ بہ) مستعار منہ کا ذکر کیا گیا ہو اور (مشبہ)مستعارلہ، کا ذکر نہ ہو۔جیسے

مصرع: ربط رہنے لگا اس شمع کو پروانوں سے

اس مثال میں صرف شمع اور پروانوں کا ذکر ہے مشبہ مستعارلہ، عاشق و معشوق کا کوئی ذکر نہیں۔

(ii) **استعارہ بالکنایہ**: وہ استعارہ ہے جس میں (مشبہ بہ) مستعار منہ کا ذکر نہ ہو۔لیکن ایسی شکل میں یہ ضروری ہے کہ مشبہ بہ کے مناسبات ولوازمات ضرور بیان کیے جائیں مثلاً

مصرع: نہیں ممکن کہ کلک فکر لکھے شعر سب اچھے

یہاں فکر کو منشی سے تشبیہ دی ہے (اور مشبہ بہ) مستعار منہ کا یعنی منشی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔لیکن کلک جو منشی کے لیے ضروری ہے اور مناسب ہے مذکور ہے۔

(4) **ایہام (توریہ)**: کلام میں ایسے الفاظ کا لانا جس کے دو معنی ہوں۔ایک قریب کے، دوسرے

دور کے۔مگرکسی خاص وجہ سے دور کے معنی مراد لینے کوایہام یا توریہ کہتے ہیں۔مثلاً ؎

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

یہاں سایہ کے دو معنی ہیں (۱) قریب کے یعنی یہی سایہ جو دھوپ کی ضد ہے ۔(۲) دور کے معنی ہیں حمایت یا پناہ اور یہاں یہی دور کے معنی (حمایت یا پناہ) مراد ہیں۔

(5) **حسنِ تعلیل**: وہ صنعت ہے جس میں کسی بات کا اصلی سبب تو کچھ اور ہو مگر شاعرانہ طور پر کچھ اور سبب بیان کیا گیا ہو۔مثلاً ؎

ہو رہا ہے ہائے میرا ماتم تشنہ لبی
رو رہا ہے خود بخود شیشے سے مل کر جام بھی

چونکہ شراب بوتل سے گلاس میں ڈالی جاتی ہے مگر یہاں شاعرانہ طور پر شیشے سے جام میں شراب لوٹنے کا ماتم سے تشبیہ دی ہے اور رونے سے مراد لی ہے۔

(6) **مراعاۃ النظیر** : کلام میں ایسے دو الفاظ کا لانا جو تضاد یا ضد کے علاوہ کوئی اور بھی مناسبت رکھتے ہوں۔جیسے دریا، موج، طوفان۔مثلاً ؎

بادہ کیا، خم کیا، سبو کیا، جام کیا، پیمانہ کیا
کر گیا نظریں ملا کر کوئی مستانہ مجھے

یہاں بادہ، خم، سبو، جام، اور پیمانہ ان سب میں ایک نسبت تو یہی ہے کہ تمام شراب کے کام میں آتے ہیں اور دوسرے معنی کی وجہ سے ان میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔مگر ان سب کے یکجائی استعمال کی وجہ سے معنی میں فرق نہیں آتا۔

حصۂ نظم

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

غزل: ایک تعارف

غزل اردو شاعری کی سب سے مشہور اور ہر دل عزیز صنفِ سخن ہے۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے اس صنفِ سخن میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اردو شاعری کے سرمایے میں بیشتر حصہ غزل کا ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی پیدائش عربی قصیدہ سے ہوئی۔ قدیم عرب قصیدہ گوئی کرتے ہوئے قصیدہ کا آغاز تشبیب سے کرتے تھے جس میں غزل کی ہئیت میں شعر قلم بند کیے جاتے تھے۔ اردو میں یہ صنف فارسی کے اثر سے آئی اور فارسی نے اسے عربی سے مستعار لیا۔

غزل کے لغوی معنیٰ 'عورتوں سے باتیں کرنا' یا 'عورتوں کے حُسن جمال کی تعریف کرنا' ہے۔ لیکن اردو غزل کبھی بھی اپنے اس محدود معنی میں قید نہیں رہی۔ اردو شعرا نے اس صنف میں عورتوں کے حسن و جمال اور ان سے حسن و عشق کی باتوں کے ساتھ ہی دیگر موضوعات و خیالات پر بھی اپنے قلم کی جولانیاں بکھیری ہیں۔ شعرائے اردو نے غزل میں مختلف کیفیات و جذبات مثلاً سیاسی، سماجی، معاشرتی مسائل کے ساتھ ہی مذہب، اخلاق، فلسفہ و تصوف، پند و نصائح کے نکات اور قدرتی مناظر و میدانِ جنگ کے واقعات تک بیان کیے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف میں شعرا نے ہر موضوع اور ہر میدان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ساخت یا ہئیت کے اعتبار سے غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف اور قافیہ پایا جاتا ہے۔ (غزل کے لیے قافیہ لازمی ہے۔) کئی شعرا نے کچھ غزلیں بغیر ردیف کے بھی کہی ہیں۔ ایسی غزلیات غیر مردّف کہلاتی ہیں۔ مطلع کے بعد بھی اگر شاعر دیگر شعر/اشعار کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ کا استعمال کرتا ہے تو ایسے شعر/اشعار حُسنِ مطلع کہلاتے ہیں۔ غزل کے بقیہ

اشعار جن کے محض دوسرے مصرعوں میں ردیف وقافیہ ہو وہ 'بیت' یا 'فرد' کہلاتے ہیں۔

غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔یعنی ہر شعر میں ایک مکمل بات یا خیال ہوتا ہے۔معنوی اعتبار سے اس کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔لیکن کبھی کبھی شاعر کوئی مضمون یا خیال ایک شعر میں مکمل بیان نہیں کرسکتا ہے تو وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے دوسرے شعر کا سہارا لیتا ہے۔لہٰذا ایسے اشعار 'قطعہ بند' شعر کہلاتے ہیں۔غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔معنوی اعتبار سے غزل کے سب سے اچھے شعر کو 'بیت الغزل' کہتے ہیں۔لیکن اس کا انتخاب غزل کہنے یا سننے والے پر منحصر ہوتا ہے۔غزل میں اشعار کی کوئی قید نہیں۔ایک مکمل غزل میں کم سے کم پانچ اشعار ہوتے ہیں۔اس سے کم پر وہ غزل نامکمل کہلاتی ہے۔عموماً غزل میں پانچ ،سات ،نو ، گیارہ ، تیرہ ، پندرہ ،سترہ ،انیس اور اکیس اشعار تک ہوتے ہیں۔اس سے زیادہ اشعار پر مبنی بھی شعرا نے کئی غزلیں کہی ہیں۔غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز واختصار ہے۔یعنی کم الفاظ میں شاعر بہت کچھ بیان کردیتا ہے۔اور یہی امر غزل کو مقبولیت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اردو میں غزل گوئی کی ابتدا حضرت امیر خسروؒ سے ہوتی ہے۔دکنی ہندوستان میں بھی قطبؔ شاہ، محمد قلی قطبؔ شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ملاوجہیؔ ،غواصیؔ ،نصرتیؔ وغیرہ نے غزلیں کہی تھیں۔لیکن یہ دور مثنوی کا دور تھا۔پھر بھی اس دور میں صنفِ غزل کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔اس دور کے غزل کے سب سے بڑے شاعر محمد قلی قطب شاہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ان کے بعد اردو غزل کو باقاعدہ ایک مستند اور عوام میں قابلِ قبول صنف کی حیثیت عطا کروانے میں ولیؔ دکنی کا کردار اہم ہے۔ولیؔ نے شمالی ہند (دہلی) آ کر اردو غزل کو نیا لہجہ اور آہنگ عطا کیا۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اردو غزل کا عروج شروع ہوا۔اس دور میں اردو کے تین باکمال شاعر پیدا ہوئے۔مرزا محمد رفیع سوداؔ (۱۷۸۱-۱۷۱۳ء)، میر تقی میرؔ ۱۸۱۰-۱۷۲۲ء) اور خواجہ میر دردؔ

(۱۷۸۵-۱۷۱۹ء) نے اردو غزل کو معراج عطا کی ۔اسی دور میں خان آرزو ،شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے شعرا بھی دنیاے ادب میں نمودار ہوئے ۔انھوں نے اردو غزل کو ایہام گوئی اور لفظی صنّاعیوں سے پاک کیا۔میر ،سودا اور درد نے اردو غزل میں حسن وعشق کی واردات کے ساتھ ہی اخلاق وتصوف کے مضامین بھی شامل کیے۔

سودا نے غزل میں تخیل کی بلندی ،قصیدہ جیسا طمطراق اور زورِ بیان پیدا کیا تو درد نے اس صنف میں صوفیانہ خیالات نظم کیے۔وہیں میر تقی میر نے اس صنف میں سوز وگداز ،آہ وفغاں ،درد وکسک کے جذبات ادا کر کے اس صنف کو آفاقیت بخشی اور ساتھ ہی سادگی ،شیرینی ،اثر آفرینی اور داخلی کیفیات کی ادائیگی سے غزل کو ہر دلعزیز بنا دیا۔اردو غزل کے لیے یہ دور سنہری دور ثابت ہوا۔میر نے اس صنف کو وہ عروج بخشا کہ بقول پروفیسر ڈاکٹر فضلِ امام ''اردو غزل کا دوسرا نام میر تقی میر ہے۔'' چنانچہ یہ کہنا کہ اردو غزل اپنی مقبولیت اور آفاقیت کے لیے ہمیشہ میر تقی میر کی مرہونِ منت رہے گی۔ بالکل صحیح و درست ہوگا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شمالی ہند میں مصحفی ،جرأت ،انشا اور رنگین جیسے شعرا نے اس صنف کی تابنا کی برقرار رکھی۔اس دور میں ان شعرا نے اردو غزل میں تصنّع ،آورد اور معاملہ بندی جیسے خیالات کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔حالانکہ یہ غزل کے معیار وتقدس کے اعتبار سے مُضِر ثابت ہوئے۔لیکن پھر بھی اردو غزل میں نئے خیالات وافکار نے اپنی جگہ بنائی۔لکھنؤ کے عیش پرور ماحول میں رہ کر ان شعرا نے غزل میں تصنّع ،آورد اور معاملہ بندی کے ساتھ ہی عریانی اور ابتذال کو بھی شامل کر لیا۔لہٰذا غزل میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ ،نوک جھونک اور اختلاط کی باتوں کا کھلے طور پر ذکر ہونے لگا۔اسی دور میں اس کے اثر سے 'ریختی' کی ایجاد ہوئی ۔'ریختی' ایسی شاعری کہلاتی ہے جس میں عورتوں کی باتیں عورتوں کی زبان میں نظم کرتے تھے۔اس سے اردو غزل میں عریانیت اور ابتذال کی شمولیت ہوئی۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی شروعات میں اردو غزل کے افق پر شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب اور حکیم مومن خاں مومن جیسے شہرۂ آفاق شاعر نمودار ہوئے۔ آتش اور ناسخ نے لکھنوی رنگ میں رہتے ہوئے غزل میں رنگینی، معاملہ بندی اور آورد کے ساتھ ہی نازک خیالی، معاملاتِ حسن و عشق اور تصوف کے جذبات سموئے تو دہلی میں ذوق دہلوی نے غزل گوئی میں اپنی استادی اور قادر الکلامی ثابت کی۔ مومن نے غزل میں معاملاتِ عشق کا بیان کر محبوب کے حسن و جمال کو غزل کا موضوع بنایا اور غزل میں تغزل پیدا کیا۔ وہیں مرزا غالب نے غزل میں نئے خیالات اور نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ غالب نے غزل میں روایات پارینہ سے ہٹ کر تخیل، فکر، فلسفہ وحکمت کے ساتھ ہی نیا اندازِ بیان رائج کر کے غزل کو ایک نئی راہ بخشی۔ یہ دور اردو غزل کا زرّیں دور کہلاتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں داغ دہلوی، امیر مینائی، جلیل مانک پوری، تسلیم لکھنوی، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی، فانی بدایونی جیسے باکمال شعرا اور پھر بیسویں صدی میں جگر مرادآبادی، عزیز لکھنوی، اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز لکھنوی، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، اختر انصاری، جاں نثار اختر، ناصر کاظمی اور ساحر لدھیانوی جیسے شعرا نے غزل کی مقبولیت میں چار چاند لگائے۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

اسداللہ خاں نام پہلے اسدؔ اور بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ نجم الدولہ، دبیرالملک، نظامِ جنگ خطابات سے نوازے گئے۔ مرزا نوشہ عرفیت تھی۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مرزا قوقان بیگ شاہ عالم، بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ مختلف ریاستوں میں مامور رہے بعد میں کسی لڑائی میں ہلاک ہوئے۔

والد کی وفات کے بعد مرزا کی تعلیم و تربیت ان کے چچا نصراللہ بیگ نے کی جو انگریز فوج میں رسالدار تھے۔ مرزا نے ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی۔ مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی امراؤ بیگم سے دلّی میں ہوئی اس کے بعد مرزا نے مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی۔

چچا کے انتقال کے بعد ایک جاگیر کے عوض سات سو روپیہ سالانہ بطور پنشن غالبؔ کو ملتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مرزا کو بڑی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کئی مہینوں تک گھر میں مقید رہے۔ مغل دربار سے وابستگی کے سبب ان کی پینشن روک دی گئی بعد میں بڑی کوششوں سے پینشن بحال ہوئی۔ غرض مرزا اپنی فیاضی اور فراخ دلی کے سبب ہمیشہ پریشان حال رہے۔

مرزا کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلے فارسی بعد میں اردو میں شاعری کرنے لگے۔ مرزا اپنی غیر معمولی ذہانت اور جدت پسند طبعیت کے سبب بہت جلد کامل اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا۔ اس طرح انھیں درباری سرپرستی حاصل ہوئی۔ آخر ۷۲ سال کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں رحلت پائی اور درگاہ حضرت نظام الدین کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔

غالبؔ ایک ذہین اور صاحب فکر انسان تھے انہوں نے اردو غزل کو اپنے اچھوتے اندازِ بیان سے مالا مال کیا۔ مرزا نے غزل میں نت نئے تجربے کیے۔ فکر کی گہرائی اور گیرائی اور نادر خیالات سے اردو شاعری میں آفاقیت پیدا کی۔ غالبؔ نے اپنے کلام میں حسن و عشق کے جذبات اور احساسات کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ خیالات کی بلندی، فکر و تخیل کی ندرت اور جدّت پسندی کے ساتھ کلام میں شوخی وظرافت کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔

غالبؔ کو فارسی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس لیے ان کے اردو کلام میں فارسی تراکیب کا استعمال کثرت سے ملتا ہے لیکن غالبؔ نے فارسی تراکیب اور سہل الفاظ میں لطیف جذبات اور احساسات کی ترجمانی اس انداز میں کی ہے کہ ان میں انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ غالبؔ کے ابتدائی کلام میں ثقیل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ مگر بعد میں غالبؔ کو احساس ہوا تو انہوں نے سہل نگاری کی طرف اپنی توجہ کی اور کلام میں خوش نما تراکیب اور سہل الفاظ کے استعمال سے عام فہم بنانے کی کوشش کی۔

غالبؔ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل میں عام روش سے ہٹ کر موضوعات اور مضامین کا انتخاب کیا۔ انہوں نے ساری زندگی مشاہدات اور تجربات کیے۔ غزل کو حسن و عشق کے محدود دائرے سے نکال کر اس میں حکیمانہ افکار اور متصوفانہ خیالات کے ذریعہ اس میں وسعت اور تنوع پیدا کیا۔ غالبؔ نے ہر زمانے اور ہر دور کی تمکین کا سامان مہیّا کرایا۔ بات میں بات نکالنے کا ہنر ہمیں جو غالبؔ کے یہاں جس تاثیر کے ساتھ ملتا ہے وہ شاید ہی کہیں ملے گا۔ وہ اپنی بات کو اختصار کے ساتھ کہنے کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں معنویت اور جامعیت قابل دید ہے۔ وہ پرانے اور فرسودہ مضامین کو اپنے اندازِ فکر اور تخیل کی بلندی سے اچھوتا اور نادر بنا دیتے ہیں۔

غالبؔ نہ صرف ایک باکمال شاعر تھے بلکہ خوش فکر نثار بھی تھے انہوں نے اردو و فارسی دونوں

زبانوں میں اپنی بے مثال نثری کارنامے انجام دئے ہیں۔ غالبؔ کے دوستوں کا ایک وسیع دائرہ تھا۔ جن سے وہ ہر وقت خط و کتابت کر کے اپنا دل بہلاتے تھے اور شاعری کے علاوہ ان کے گزر اوقات کا ذریعہ بھی تھا۔ غالبؔ نے دوستوں کو جو خطوط لکھے وہ اُردو میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے ایک طرزِ خاص کی ایجاد کی۔ انہوں نے خطوط میں مروجہ القاب و آداب کو ترک کیا۔ بے محل اور بے موقع گفتگو سے پرہیز کیا۔ زبان بے تکلف سادہ اور پر لطف استعمال کی۔ انداز ایسا گویا دو شخص آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہوں۔ بعد میں غالبؔ کے لکھے ہوئے یہ خطوط مختلف مجموعوں کی شکل میں شایع ہوئے۔ ''اُردوئے معلّٰی''، ''عودِ ہندی'' اور ''خطوط غالبؔ'' ان کے خطوط کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ غالبؔ کی دیگر تصانیف میں 'دیوانِ غالبؔ'، 'کلیاتِ نظم فارسی'، 'مثنوی شانِ نبوت و ولادت'، 'چراغِ دیر'، 'دستنبو'، قاطعِ برہان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

غالب کی شخصیت اُردو شعروادب کے لیے گراں مایہ سرمایہ ہے۔ ایسا سرمایہ جس کی چمک رہتی دنیا تک قایم رہے گی۔

مرزا غالبؔ

غزل

(۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم‘ تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا‘ غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے‘ شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا‘ نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا ‘ کہ یگانہ ہے وہ یکتا؟
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا غالبؔ

غزل

(۲)

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذّتِ آزار دیکھ کر

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برق تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مشکل الفاظ اوران کے معانی

غزل (۱)

الفاظ	معانی
وصالِ یار	دوست سے ملاقات
نیم کش	آدھا کھچا ہوا
خلش	چبھن؛ اضطراب
ناصح	نصیحت کرنے والا
چارہ ساز	علاج کرنے والا، معالج
غم گسار	ہمدرد، غمخوار
جاں گسل	جان کو گھٹانے والا؛ عمر کم کرنے والا
غمِ روزگار	زمانے کا غم، دنیا کا درد
بادہ خوار	شرابی

غزل (۲)

تابِ رخِ یار	دوست (محبوب) کے چہرے کی تجلّی (چمک)
آتش پرست	آگ کو پوجنے والا؛ پارسی مذہب کا پیروکار
اہلِ جہاں	دنیادار۔ عام انسان

شرر بار	شعلے برسانے والا
مینا	صراحی، شراب کی بوتل
واحسرتا	ہائے افسوس
حریص	لالچی
پرخار	کانٹوں سے بھرا ہوا۔
بادہ	شراب
ظرف	برتن، پیالہ
قدح خوار	شرابی
شوریدہ حال	پریشان حال

مشقی سوالات

مختصرین سوالات:

۱۔ مرزا غالبؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲ غالبؔ کی عرفیت کیا تھی؟

۳۔ شاعر کا جی کیا دیکھ کر خوش ہوا؟

مختصر سوالات:

۴۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
مرزا غالبؔ نے مذکورہ شعر میں کیا بات بیان کی ہے؟

۵۔ گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
غالب کے مندرجہ بالا شعر کا مطلب لکھئے۔

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔
وصالِ یار۔ نیم کش۔ ناصح۔ آتش پرست۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ مرزا غالبؔ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالئے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بیان کیجئے۔

۸۔ مرزا غالبؔ کی پہلی غزل کے شعر نمبر ۲،۳،۴، ۸ اور دوسری غزل کے شعر نمبر ۴، ۶ اور ۸ کے مطلب لکھئے۔

مومن خاں مومنؔ

مومن خاں نام مومنؔ ہی تخلص تھا۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ حکمت ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ آپ کے دادا طبیب کی حیثیت سے شاہی دربار میں ملازم تھے۔ شاہی خدمت کے صلے میں انھیں چند مواضعات جاگیر میں ملے تھے۔ بعد میں انگریزی سرکار نے جاگیر کے عوض میں پینشن مقرر کردی تھی۔ مومنؔ کو بھی وراثت میں یہ پینشن ملتی رہی۔

مومنؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ شاہ عبدالقادر سے عربی کا درس لیا، طب کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ مومنؔ کو ریاضی، علم نجوم اور رمل وغیرہ میں مہارت تھی شطرنج کے بھی ماہر تھے۔ خوشحال گھرانے سے تعلق کے سبب معاشی فکرات سے آزاد رہے۔ مومن بڑے خوش طبع، زندہ دل، یار باش اور آزاد مشرب انسان تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

مومنؔ نے اس دور میں آنکھ کھولی جب سوداؔ، میرؔ، دردؔ اور سوزؔ جیسے کامل الفن اساتذہ کی شاعری کے چرچے ہو رہے تھے۔ ایسی پر کیف فضا میں مومنؔ کی شاعری پروان چڑھی۔ مومنؔ نے اردو غزل کو اس کے حقیقی معنی میں استعمال کیا اور اس میں ایک اچھوتے پن کا احساس کرایا۔ حالاں کہ ان کی غزل حسن و عشق کے محدود دائرے میں رہی مگر انہوں نے اپنی فکر انگیزی سے اس میں جدتیں پیدا کیں اور معاملاتِ حسن و عشق کو اس طرح پیش کیا کہ ہر جگہ نئی کیفیت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

مومنؔ کی غزلوں میں نازک خیالی، اسلوب کی جدّت، سادگی، روانی، برجستگی اور جذبات کی شدت سبھی کچھ موجود ہے۔ مومن اپنی طبیعت کی رنگینی کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہر جگہ حسن و عشق، نزاکت، لطافت اور رنگین بیانی نظر آتی ہے۔ مومن کی غزلوں میں اثر آفرینی اور جذبات

کی صداقت کے ساتھ وارداتِ حقیقی کا بیان نمایاں ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے مؤثر مضامین باندھتے ہیں۔ انھوں نے مقطع میں اکثر تخلص کو بڑی رعایت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

یہ بات بھی بہت مشہور ہے کہ ایک مشاعرے میں جب مومنؔ نے یہ شعر پڑھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو یہ شعر مرزا غالبؔ کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اس شعر کے عوض میں اپنا پورا دیوان دینے کی پیش کش کی۔

مومنؔ کے کلام میں اسلوب کی جدت، پیچیدگی اور سادگی کے متضاد عناصر بھی شامل ہیں۔ نازک خیالی اور طرز ادا کا لطیف پیرایہ ان کی غزلوں میں نرالی شان پیدا کرتے ہیں۔ مومنؔ نے حسن و عشق کے بندھے ٹکے مضامین میں وہ تنوع پیدا کیا کہ اس میں جاذبیت کا حسن منفرد انداز لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی بات کو غیر معروف پیرایہ میں کہنے کو فوقیت دی۔ وہ اپنی بات فلسفیانہ اور حکمت آمیزی کے ساتھ کہنے کے قائل نہیں اور نہ ہی ان کی شاعری میں اخلاقی قدروں کی پیش رفت ہے مگر ان کی شاعری قدیم اندازِ بیان کے ساتھ ذہنوں میں ایک نئی ترنگ اور نغمگی پیدا کرتی ہے۔ وہ عشقِ مجازی کے غمّاز اور حسن لامُتناہی کے پرستار ہیں اور ان کی تمام تر شاعری کا دارو مدار اسی پر موقوف ہے۔ مومن کی چند مثنویاں اور قصائد بھی ہیں لیکن ان کی پوری توجہ غزلوں پر ہی مرکوز رہی۔

مومنؔ اپنے منفرد اور مخصوص شعری مزاج کے سبب اردو شاعری میں ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے بڑے مشہور اور مقبول شاعر تھے۔ ان کے شاگردوں میں نواب غلام مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، تسکینؔ، وحشتؔ اور نسیمؔ جیسے قادر الکلام شاعر شامل ہیں۔

مومنؔ علم نجوم اور تاریخ گوئی میں بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی تاریخ وفات خود نکالی تھی جو سچ ثابت ہوئی یعنی دست و باز و بشکست (۱۲۵۸ء)

مطابق ۱۸۵۱ء میں انھوں نے اسی شکستہ حالی میں وفات پائی۔

حکیم مومن خاں مومنؔ

غزل

(۱)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم
حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے! کیا کیا لے کر
دل، کسی کام کا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ، دل سے، جُدا نہیں ہوتا

چارۂ دِل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرضِ مضطر، اے مومنؔ
صنم، آخر خُدا نہیں ہوتا

حکیم مومن خاں مومنؔ

غزل

(۲)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم
منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
اس کوُ میں جا مریں گے، مددا ے ہجومِ عشق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

غزل(۱)

الفاظ	معانی
راحت فزا	خوشی دینے والا
اغیار	غیر کی جمع ،اجنبی لوگ ،دشمن
ناصح	نصیحت کرنے والا
مضطر	پریشان ،بے چین
صنم	بت ،معشوق

غزل(۲)

ناچار	مجبور ،بےبس
بےکسی	لاچاری ،عاجزی ،مجبوری
کُو	کوچہ ،گلی
ربط	میل جول ،تعلق

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ مومنؔ کا پورا نام بتائیے۔

۲۔ مومنؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۳۔ شاعر نے دل میں کیا ٹھانی تھی؟

مختصر سوالات:

۴۔ تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

مومنؔ کے مذکورہ شعر کا مطلب لکھیے۔

۵۔ ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

مومنؔ کے اس شعر کی وضاحت کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔

اغیار۔ ناصح۔ مضطر۔ ناچار۔ ربط۔ بدعتی۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ حکیم مومن خاں مومنؔ کے حالاتِ زندگی تحریر کیجیے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں پر روشنی بھی ڈالیے

۸۔ مومنؔ کی پہلی غزل کے شعر نمبر ۱، ۲، ۳ اور دوسری غزل کے شعر نمبر ۱، ۳ اور ۵ کے مطلب لکھیے۔

نواب مرزا خاں داؔغ

نواب مرزا داؔغ ۲۵/مئی ۱۸۳۱ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے ۔نواب شمس الدین خاں فیروز پور جھرکہ کے فرزند تھے ۔داؔغ جب سات برس کے تھے تو ان کے والد غدر کے ہنگامے میں انگریزوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے ۔داؔغ کی والدہ وزیر بیگم کا دوسرا نکاح ۱۸۴۴ء میں ولی عہد سلطنت غلام فخرالدین سے ہوا جو بہادر شاہ ظفؔر کے بیٹے تھے۔

اس وقت داؔغ کی عمر ۱۳/ برس تھی ۔داؔغ بچپن سے بڑے ذہین اور ہونہار تھے ۔لہٰذا انھیں خاقانی ہند استاد ذوقؔ کے سپرد کر دیا گیا۔قریب دس سال داؔغ نے ذوقؔ سے فیض اٹھایا۔اس دوران وہ غالبؔ سے بھی ملتے رہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ غالبؔ سے داؔغ کے متعلق دریافت کیا گیا تو غالبؔ نے کہا۔''داؔغ کی اردو ایسی عمدہ ہے کہ کیا کسی کی ہوگی۔ذوقؔ نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا داؔغ نہ صرف اس کو پال رہا ہے بلکہ تعلیم دے رہا ہے۔''

۱۸۵۶ء میں مرزا فخرالدین کے انتقال کے بعد داؔغ رامپور چلے آئے ۔وہاں نواب یوسف علی خاں ناظمؔ نے ان کی بڑی قدر دانی کی اور جب تک زندہ رہے داؔغ کی سرپرستی کرتے رہے۔اس کے بعد ان کے ولی عہد نواب کلب علی خاں نے داؔغ کو بڑی عزت بخشی اور انھیں فراش خانے اور اصطبل کا داروغہ بنایا۔داؔغ نے انھیں کے ساتھ فریضۂ حج بھی ادا کیا۔تقریباً تیس سال دربار سے وابستگی کے بعد حیدرآباد کا رُخ کیا۔رام پور میں قیام کے دوران مظفر علی اسیؔر،امیر مینائیؔ،سید ضامن علی جلالؔ اور اسمٰعیل حسین منیؔر جیسے باکمال اساتذہ سے صحبت رہی مگر داؔغ کی مقبولیت ان سب سے زیادہ تھی۔

حیدرآباد میں وہاں کے نواب محبوب علی خاں نے داؔغ کو اپنا مشیر سخن (استاد) مقرر کیا اور چار سو

روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی بعد میں اس میں اضافہ ہوااور تنخواہ سترہ سو روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ اتنی بڑی تنخواہ تھی جو اس زمانے میں کسی شاعر کو میسر نہ تھی۔ اس کے علاوہ نظام حیدرآباد نے انھیں ناظم یار جنگ ، دبیرالدولہ اور فصیح الملک کے خطابات کے ساتھ جاگیر بھی عطا کی۔ حیدرآباد میں آکر داغؔ نے بڑے عیش ونشاط کی زندگی بسر کی اور یہیں ۱۶رفروری ۱۹۰۵ءکو فالج کے اثر کے بعد انتقال کیا۔

داغؔ اردو شاعری کے بے حد کامیاب اور مقبول شاعر تھے۔ان کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔شاگردوں کی تعداد کے پیشِ نظر انھوں نے ایک دفتر کھول رکھا تھا جس میں ان کا رجسٹریشن (اندارج) کیا جاتا تھا۔داغؔ کے مشہور تلامذہ میں محبوب علی خاں آصفؔ، وحید الدین بیخودؔ دہلوی، علامہ اقبالؔ، ناطقؔ گلاوٹھی، محمد علی جوہرؔ، جگرؔ مرادآبادی، آغا شاعر قزلباش، سائلؔ دہلوی، سیمابؔ اکبرآبادی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

داغؔ ایک پُر گو شاعر تھے ان کو زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل تھی۔داغؔ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی اصلاح کی اور اس میں حسن و نکھار پیدا کیا۔داغؔ اپنے ہم عصروں میں بڑے مشہور تھے۔داغؔ کی شاعری عشق مجازی پر محمول ہے۔وہ حسن وعشق کے معاملات کو بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔ان کے کلام میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ، محبوب کی اداؤں پر فریفتہ ہونا، شوخی، چلبلا پن اور بعض جگہ عامیانہ پن و ابتذال سے بھی کام لیتے ہیں۔داغؔ کی زبان دہلی کی ٹکسالی، بامحاورہ، سادہ، اور سلیس زبان ہے۔زبان کا چٹخارہ اس میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔شاید ہی ان کا کوئی شعر لطفِ زبان سے خالی ہو۔سطحی عشقیہ جذبات اور احساسات ہی ان کی شاعری کی جان ہیں۔معاملہ بندی، رنگینی اور شوخی لطفِ زبان انکی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔داغؔ کی غزلوں میں نسوانی جذبات کی عکاسی بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔داغؔ کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں وہی پیش کیا ہے جو وہ اپنے اردگرد محسوس کررہے تھے۔اس میں بناوٹ نہیں ہے۔اسی وجہ سے ان کی شاعری

کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔ ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داؔغ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داؔغ کی وفات پران کے شاگرد علاّمہ اقباؔل نے اپنے مہربان استاد کی یاد میں ایک مرثیہ بعنوان ''مرثیۂ داؔغ'' لکھا، جو بہت مقبول اور مشہور ہوا۔اس مرثیے کا ایک شعر دیکھیے۔ ؎

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں

تو بھی رو اے خاکِ دلّی، داؔغ کو روتا ہوں میں

داؔغ کی وفات کے بعد ان کے رنگ کو آگے بڑھانے والوں میں نوؔح، سائلؔ اور بےخوؔد دہلوی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نواب مرزا داؔغ کی تصانیف میں چار دیوان ''گلزارِ داؔغ''، ''آفتابِ داؔغ''، ''مہتابِ داؔغ'' اور ''یادگارِ داؔغ'' ہیں اس کے علاوہ ایک مثنوی ''فریادِ داؔغ'' ہے۔انھوں نے چند قصائد اور دہلی کے حالات پر ایک شہرآشوب بھی نظم کیا ہے۔

داغؔ دہلوی

غزل

(۱)

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کرتے ہیں قتل وہ طلبِ مغفرت کے بعد
جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں

جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشتِ خاک
اس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں

کیا جواب؟ حضرتِ دل! دیکھیے ذرا
پیغام بَر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

کیا اضطراب شوق نے مجھ کو خجل کیا
وہ پوچھتے ہیں کہیے ارادے کہاں کے ہیں

داغؔ دہلوی

غزل

(۲)

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

جب ان کو طرزِ ستم آ گئی تو ہوش آیا
بُرا ہو دل کا بُرے وقت ہوشیار کیا

کچھ آ گے داورِ محشر سے ہے اُمیّد مجھے
کچھ آپ نے میرے کہنے کا اعتبار کیا

کسی کے عشق نہاں میں یہ بدگمانی تھی
کہ ڈرتے ڈرتے خُدا پر بھی آشکار کیا

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے
ستم کیا تو بڑا تُو نے افتخار کیا

بنے گا مہرِ قیامت بھی ایک خالِ سیاہ
جو چہرہ داغِ سیہ رو نے آشکار کیا

مشکل الفاظ اوران کے معانی

غزل(۱)

الفاظ	معانی
شرمسار	شرمندہ‘نادم
داورِمحشر	قیامت کے دن انصاف کرنے والا‘اللہ تعالیٰ
افتخار	فخر‘عزت
مہرِقیامت	قیامت کی مہر(چھاپ)
خالِ سیاہ	کالاتل
سیہ رو	شرمندہ‘گنہ گار

غزل(۲)

آشکار	ظاہر‘واضح
کون ومکاں	دُنیا
طلب مغفرت	بخشش(نجات)کی خواہش
مشت خاک	مٹھی بھرخاک‘بمعنی انسان
اضطراب	بے چینی‘بےقراری
خجل	شرمندہ‘شرسار

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

(۱) داغؔ دہلوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(۲) داغؔ کے کسی ایک دیوان کا نام لکھیے۔

(۳) مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔

داورِ محشر۔ خالِ سیاہ۔ کون ومکاں۔ خجل۔

مختصر سوالات:

(۴) 'قیامت کا انتظار' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

(۵) مندرجہ ذیل شعر کا مطلب لکھئے۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

(۶) داغؔ دہلوی کے دو اشعار (اپنی پسند سے) لکھئے۔

تفصیلی سوالات:

(۷) داغؔ دہلوی کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی پر تبصرہ کیجیے۔

(۸) داغؔ دہلوی کی شامل نصاب پہلی غزل کے مطلع اور مقطع نیز دوسری غزل کے شعر نمبر ۲، ۳ اور ۴ کے مطلب لکھئے۔

جگؔر مرادآبادی

علی سکندر نام اور جگؔر تخلص تھا۔۱۸۹۳ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد مولوی نظر علی نؔظر ایک صاحب دیوان شاعر تھے اور خواجہ وزیؔر لکھنوی کے شاگرد تھے گویا جگؔر کو شاعری وراثت میں ملی ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی ۔ سات برس کی عمر میں والد کے ساتھ مراد آباد چلے آئے ۔ نوعمری سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے ۔ ابتدا میں والد سے اصلاح لی پھر داؔغ دہلوی اور امیر اللہ تسؔلیم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مشن اسکول لکھنو میں زیر تعلیم تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا تو نویں جماعت میں فیل ہو گئے اور انھوں نے تعلیم بھی ترک کر دی ۔ جگؔر کے چچا نے انہیں میونسپلٹی میں ملازمت دلوائی ۔ کچھ عرصہ بعد آگرہ پہنچ کر انہوں نے شادی کی بعد میں والدہ اور بیوی کو ساتھ لے کر مرآباد چلے آئے ۔ وہاں انہوں نے چشموں کا کاروبار شروع کیا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ فیض آباد، اعظم گڑھ، گونڈہ و دیگر شہروں میں بھی آتے جاتے رہے۔ شراب نوشی کے سبب ہمیشہ سرگرداں حال رہے۔

بعد میں اصغؔر گونڈوی کے سمجھانے پر انہوں نے شراب نوشی سے توبہ کی اور ۱۹۵۳ء میں فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ جگؔر نے اپنی زندگی کے آخری دور میں تصوف وحکیمانہ فکر کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ ان کی شعری وراثت میں تین مجموعۂ کلام ''داغِ جگؔر''، ''شعلۂ طور'' اور ''آتش گل''، یادگار ہیں۔ آخری مجموعہ پر انھیں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا تھا۔ اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی۔

جگؔر نے ایک عرصہ تک علیل رہنے کے بعد گونڈہ میں ۱۹۶۰ء میں وفات پائی۔ جگؔر اپنے عہد کے بڑے مقبول شاعر تھے۔ وہ اپنے مخصوص ترنم اور نغمگی کے سبب مشاعروں میں چھا جاتے تھے۔ جگؔر کا

یہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ ہر ایک ان کی تقلید کرتا نظر آتا تھا۔جگر کی غزلوں میں سرمستی، سرشاری اور والہانہ پن دیکھتے ہی بنتا ہے۔زبان کے لحاظ سے وہ سادگی، روانی اور برجستگی کے قائل ہیں وہ مشکل الفاظ اور بھاری بھرکم فارسی تراکیب سے گریز کرتے ہیں۔یہی چیزیں ان کے کلام کو زیادہ تاثیر بخشتی ہیں۔ان کی غزلوں میں ہم عصر زندگی کی کشمکش اور انسانی مسائل سے آگہی کے ساتھ جذبات اور احساسات کا برملا اظہار بھی موجود ہے۔

جگر کی شاعری کا اصل رنگ ''شعلۂ طور'' میں ظاہر ہوتا ہے۔شعلۂ طور کی غزلوں میں غضب کی دلکشی، مستی اور والہانہ پن موجود ہے۔کلام میں ایسی کشش اور وارفتگی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے پر سحر طاری کر دیتی ہیں۔شعلۂ طور کا یہ شعر بطور خاص ملاحظہ کیجیے۔؎

دل گیا رونقِ حیات گئی　　　غم گیا ساری کائنات گئی

اس طرح جگر کا آخری مجموعۂ کلام ''آتش گل'' بھی مرصع اور حسین ترین غزلوں سے معمور ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں حسن و عشق کے موضوعات کو بڑی خوبصورتی اور دل نشینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔جگر نے اپنی غزلوں میں ہم عصر زندگی کی کشمکش اور دیگر انسانی مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔ان کے آخری دور کے کلام میں فلسفیانہ، صوفیانہ اور اخلاقی ہر طرح کے موضوعات کا اظہار ملتا ہے۔جگر کے کلام میں کہیں کہیں تقسیم وطن کے حالات کا کرب بھی نظر آتا ہے۔

جگر نے زبان کے معاملے میں قدیم اساتذہ کی تقلید کی لیکن فارسی الفاظ اور تراکیب سے بچنے کی بھی کوشش کی ہے۔سہل لب و لہجہ اور شیریں الفاظ ان کے کلام کو مزید دلکشی بخشتے ہیں۔اس لیے ان کے کلام میں دلکش اور روانی ہر جگہ نظر آتی ہے۔کلام کی یہی خصوصیات ان کی مقبولیت کا سبب ہیں۔

جگرؔ مرادآبادی

غزل

(۱)

دِل کو سکون، روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

جب کوئی ذِکرِ گردشِ ایّام آ گیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا

غم میں بھی سُرور وہ ہنگام آ گیا
شاید کہ دورِ بادۂ گلفام آ گیا

دیوانگی ہو، عقل ہو، امید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آ گیا

صیاد شادماں ہے مگر یہ تو سوچ لے
میں آ گیا کہ سایہ تہِ دام آ گیا

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا

احباب مجھ سے قطعِ تعلق کریں جگرؔ
اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا

جگر مرادآبادی

غزل

(۲)

برابر سے بچ کر گزر جانے والے
یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے

نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے

مرے دل کی بے تابیاں بھی لیے جا
دبے پاؤں منہ پھیر کر جانے والے

ترے اک اشارے پہ ساکت کھڑے ہیں
''نہیں'' کہہ کہ سب سے گذر جانے والے

محبت میں ہم تو جیے ہیں، جئیں گے
وہ ہوں گے کوئی اور مرجانے والے

مشکل الفاظ اوران کے معانی

غزل نمبرا

الفاظ	معانی
گردشِ ایام	مصیبت کے دن، بُرے دن
سُرُور	خوشی، انبساط، ہلکا نشہ
بادۂ گلفام	سرخ شراب
یاس	ناامیدی، مایوسی
زیست	زندگی

غزل نمبر۲

الفاظ	معانی
نالے	فریاد، شوروفغاں
ساکت	بےحرکت، خاموش
دبے پاؤں	چپ چاپ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

(۱) جگرؔ مرادآبادی کا پورا نام بتایئے۔

(۲) جگرؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(۳) جگرؔ کے مطابق' دل کو سکون اور روح کو آرام' کیسے آیا؟

مختصراً سوالات:

(۴) جگرؔ مرادآبادی کی تخلیقات کے نام بتایئے۔

(۵) مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتایئے۔

گردشِ ایّام۔ بادۂ گلفام۔ زیست۔ نالے

(۶) مندرجہ ذیل شعر کا مطلب لکھیے۔

نہیں جانتے کہ جانا کہاں ہے
چلے جارہے ہیں مگر جانے والے

تفصیلی سوالات:

(۷) جگرؔ مرادآبادی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے اور ان کی غزل گوئی کی خوبیوں پر تبصرہ کیجیے۔

(۸) نصاب میں شامل جگرؔ کی غزل نمبر ا کے شعر نمبر ۲' ۴' ۵ اور غزل ۲ کے شعر نمبر ا' ۲ اور ۵ کے مطلب لکھیے۔

فراؔق گورکھپوری

فراؔق کا اصلی نام رگھو پتی سہائے تھا۔فراؔق تخلص ۔۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرؔت پیشہ سے وکیل اور بڑے خوش فکر شاعر تھے۔فراؔق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی ۔ بعد میں ایف ۔اے۔کی تعلیم کے لیے الہ آباد چلے آئے ۔ یہاں انھیں پروفیسر ناصری کی صحبت اور رہنمائی حاصل ہوئی۔ پروفیسر ناصری عربی وفارسی کے استاد تھے، جو شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتے تھے۔فراؔق نے پہلے آپ سے مشورۂ سخن کیا بعد میں وسیؔم خیرآبادی کو اپنا استاد بنایا۔

فراؔق نے ۱۹۱۸ء میں سول سروس کا امتحان پاس کیا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے لیکن انہوں نے ملازمت نہیں کی اور تحریکِ آزادی میں شامل ہو گئے۔اس سلسلے میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔جیل میں ان کا ساتھ مولانا محمد علی جوہر، حسرؔت موہانی اور ابوالکلام آزاؔد جیسے باذوق اساتذہ سے رہا جن کی صحبت میں انھیں شعر گوئی کی ترغیب ملی۔

۱۹۲۷ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد پہلے کرسچین کالج لکھنؤ میں اور پھر ایس۔ ڈی۔ کالج کانپور میں اردو پڑھانے پر مامور ہوئے۔اسی اثنا میں فراؔق نے انگریزی میں ایم۔اے۔کیا اور الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے اور وہیں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔حکومتِ ہند نے ان کی شعری خدمات پر ۱۹۷۶ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا۔انھوں نے ۳؍مارچ ۱۹۸۲ء کو اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

فراؔق اپنے دور کے بہت مشہور اور مقبول شاعر تھے۔انہوں نے نظمیں اور رباعیات بھی کہی ہیں لیکن غزل ہی ان کی پہچان کا سبب بنی۔ان کے ابتدائی کلام میں امیؔر مینائی اور عزیؔز وصفؔی کا رنگ ملتا ہے

اور کہیں کہیں میرؔ کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔غمِ حیات اور غمِ جاناں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان بھی کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔فراقؔ کی شاعری میں حسن وعشق کی نفسیات اور جذبات کا اتار چڑھاؤ جا بجا ملتا ہے۔ فراقؔ عشق کے روایتی تصور سے الگ ہٹ کر بات کہتے ہیں۔

فراقؔ نے اکثر طویل غزلیں کہی ہیں۔مطالعہ کی وسعت نے ان کے اندازِ بیان میں پختگی اور تخیل میں ندرت پیدا کر دی ہے۔وہ بلا شبہ بیسویں صدی کے نامور اور مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں 'شعلۂ ساز'، 'روحِ کائنات'، 'شبستان'، 'پچھلی رات'، 'روپ' اور 'گلِ نغمہ' وغیرہ یادگار ہیں۔

فراقؔ کی مقبولیت کا سبب ان کی غزلیں ہیں جن میں حسن وعشق کے مختلف رنگ، جمالیاتی تاثیر کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ان کے کلام میں حسن و جمال کی بڑی دل کش اور جاندار تصویریں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں حسن سے لطف اٹھانے کا تصور موجود ہے۔عشق ان کے یہاں صرف جسمانی تسکین کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ روحانی احساسات اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ان کے خیال میں بغیر اس جذبے کے کوئی عظیم شاعری جنم ہی نہیں لے سکتی۔فراقؔ نے اپنی شاعری میں قدیم روایتوں سے فائدہ اٹھایا ہے انھوں نے میرؔ، غالبؔ و مصحفیؔ سے لے کر حسرتؔ موہانی تک کے ہر بڑے شاعر کے کلام سے استفادہ کیا۔البتہ انہوں نے اپنی شاعرانہ خوبیوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر ان موضوعات میں نئی جان ڈال دی ہے۔

فراقؔ نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں پھیکی نظر آتی ہیں حالانکہ ان میں کچھ نظمیں تمام خصوصیات کی حامل ہیں انہوں نے اپنی نظموں میں عشقیہ، المیہ، سیاسی اور سوانحی ہر طرح کے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔فراقؔ نے بعض رومانی نظمیں بھی کہی ہیں اور کچھ میں اپنے عہد کے حالات کا عکس نظر آتا ہے ان کی کامیاب نظموں میں 'جگنو'، 'ہاں اے دل افسردہ'،

'پرچھائیاں'، 'شامِ عیادت'، 'ہنڈولہ'، 'فضا میں جیسے گلابی سی کوئی چھلکا دے' وغیرہ کافی مشہور نظمیں ہیں۔

فراقؔ نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ان رباعیوں میں بھی انہوں نے زورِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔فراقؔ کا احساسِ جمال ان رباعیوں میں چھلکتا ہے۔انہوں نے غزلوں میں حسن و جمال کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہی کیفیت ان کی رباعیوں میں بھی نظر آتی ہے۔

مجموعی طور پر فراقؔ بیسویں صدی کے بڑے قدّ آور اور منفرد حیثیت کے شاعر ہیں ان کی مقبولیت اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں قدیم اور جدید قدروں کی پاسداری کی اور شاعری میں ان موضوعات اور پہلوؤں کا انتخاب کیا۔جن میں اپنے عہد کے جذبات اور احساسات کے ساتھ عصری تقاضے بھی شامل تھے۔

فراؔق گورکھپوری

غزل

(۱)

آنکھوں میں جو بات ہوگئی ہے / اِک شرح حیات ہو گئی ہے
جب دل کی وفات ہوگئی ہے / ہر چیز کی رات ہو گئی ہے
غم سے چھُٹ کر یہ غم ہے مجھ کو / کیوں غم سے نجات ہوگئی ہے
مُدّت سے خبر ملی نہ دل کی / شاید کوئی بات ہو گئی ہے
جو چیز بھی مجھ کو ہاتھ آئی / تیری سوغات ہو گئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی / بیمار کی رات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں / جب غم سے نجات ہوگئی ہے

ایک ایک صفت فراؔق اُس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

فراقؔ گورکھپوری

غزل

(۲)

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

اب دورِ آسماں ہے، نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر! تو ہی بتا کتنی رات ہے

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل! تیری تو کیا کائنات ہے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرقِ مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

یہ مؤشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر
کس کو دماغِ کاوشِ ذات و صفات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں، فرصت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیاتِ فراقؔ ! ایک رات ہے

مشکل الفاظ اوران کے معانی

غزل(۱)

الفاظ	معانی
شرحِ حیات	زندگی کی تفسیر،زندگی کی وضاحت
سوغات	تحفہ،ہدیہ
قدریں	قیمتیں،توقیر،اہمیت (قدر کی جمع)
برگِ نبات	ہری بھری،ہریالی

غزل(۲)

الفاظ	معانی
کائنات	دنیا،حقیقت
دردِ ہجر	جدائی کا درد
لامکاں	دوسرا عالم،عالمِ قدس، خداتعالیٰ
زندانِ عقل	عقل مند،فلسفی،عقل کے اسیر
مرگ وزیست	موت اور زندگی
مؤشگافیاں	نکتہ چینی، چھان بین
گراں	وزنی،مشکل

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ فراقؔ گورکھپوری کا پورا نام کیا تھا؟

۲۔ فراقؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

۳۔ شاعر نے 'ہاتھ آئی چیز' کو کیا کہا ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ فراقؔ کے مندرجہ ذیل شعر کا مطلب بتائیے۔

اس دور میں زندگی بشر کی   بیمار کی رات ہو گئی ہے

۵۔ فراقؔ گورکھپوری کو کونسا اہم ایوارڈ دیا گیا تھا؟ اور کب دیا گیا؟

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں سے سابقے اور لاحقے بتائیے۔

شرحِ حیات، مرگِ نبات، زندانِ عقل، مرگ وزیست

تفصیلی سوالات:

۷۔ فراقؔ گورکھپوری کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بھی بیان کیجیے۔

۸۔ شامل نصاب فراقؔ کی پہلی غزل کے شعر نمبر ۳، ۷ اور ۸۔ اور دوسری غزل کے شعر نمبر ۱، ۳ اور ۴ کے مطلب لکھیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

قصیدہ: صنف اور مختصر تاریخ

قصیدہ عربی لفظ ہے جس کے معنی لغت نویسوں نے ''گاڑھا مغز'' ''مغز غلیظ'' او'' دلدار یا چربی دار گودا'' بتائے ہیں۔ بعض عالموں کا یہ بھی خیال ہے کہ قصیدہ لفظ ''قصد'' سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ''ارادہ کرنا'' ہوتا ہے۔ اصطلاح شاعری میں قصیدہ اس شعری تخلیق کو کہتے ہیں جس کے تحت شاعر کسی شخص کی مدح (تعریف) یا مذمّت (یعنی ہجواور برائی) کرتا ہے۔

اردو و فارسی میں عام طور پر قصیدہ کا لفظ اس نظم کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں کسی مربی یا بزرگ کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہے۔ غزل کی طرح قصیدہ کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدہ میں اشعار کی تعداد معیّن یا مقرّر نہیں ہوتی۔ قصیدہ ہر بحر میں کہا جاسکتا ہے۔ قصیدہ میں بھی غزل کی طرح شاعر مقطع کا اہتمام کرتا ہے۔

قصیدہ کی دو اہم قسمیں ہوتی ہیں، یعنی ''خطابیہ'' اور تمہیدیہ'' خطابیہ اس قصیدہ کو کہتے ہیں جس میں شاعر بغیر کسی تمہید کے اظہار مقصد کرتا ہے جبکہ تمہیدیہ قصیدہ اسے کہتے ہیں جس میں شاعر شروعات میں تمہید باندھتا ہے اور اس کے بعد مدّعا بیان کرتا ہے۔ قصیدے میں پرشکوہ الفاظ اور بلند آہنگی کی اہمیت مسلّم ہے۔ قصیدہ پانچ اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ تشبیب:

اسے نسیب یا تمہید بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں حسن وعشق، فلسفہ وحکمت، شراب و شباب، موسم بہار کی منظر کشی، خود شناسی، پند ونصیحت اور دنیا کی بے ثباتی یا کوئی دلکش مضمون باندھا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ

تشبیب کے موضوعات لامحدود ہیں۔

۲۔ گریز :

تشبیب کے بعد شاعر مدح کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے گریز کے اشعار کہتا ہے۔گریز تشبیب اور مدح کو جوڑنے والی کڑی ہوتی ہے، جس سے ربط و تسلسل برقرار رہتا ہے۔

۳۔ مدح یا مذمّت :

صنف قصیدہ کا یہ سب سے اہم اور اصل حصّہ ہوتا ہے۔مدح میں شاعر عموماً اپنے ممدوح کی تعریف وستائش کرتا ہے جس میں اس کے جاہ وجلال، شجاعت وسخاوت، علم وفضل اور عدل وانصاف وغیرہ کی تعریف ہوتی ہے۔یہاں شاعر مبالغہ آمیز انداز بیان اختیار کرتا ہے۔مرثیہ کی طرح یہاں بھی گھوڑے تلوار اور ہاتھیوں کی تعریف کی جاتی ہے۔اگر کسی قصیدہ میں مذمّت بیان کرنا مقصد ہو تو شاعر متعلقہ شخص کے عیب اور برائیوں کو ظاہر کرتا ہے۔

۴۔ حُسن طلب، مدّعا یا عرضِ مطلب :

شاعر قصیدہ کو انجام یا اختتام تک پہنچانے سے قبل اکثر ایسے اشعار تخلیق کرتا ہے جن میں اپنے ممدوح سے کسی طرح کی بخشش، اعزاز واکرام یا صلے کی خواہش شامل ہوتی ہے۔

۵۔ دُعا :

یہ قصیدے کا آخری حصّہ ہوتا ہے جس میں شاعر اپنے ممدوح کے لیے صحت، سلامتی، درازی عمر اور خیر وعافیت کی دعا اور اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کے لیے بددعا کرتا ہے۔

اردو میں قصیدہ نگاری کا آغاز خطّۂ دکن میں ہوا۔سلاطین بہمنی میں مشتاقؔ اور لطفیؔ نامی شاعروں نے قصیدہ گوئی کو رواج دیا۔گول کنڈہ کے سلطان اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ

مانؔی اوران کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ ظلل اللہ کے علاوہ نصرتیؔ ،غواصیؔ،ابن نشاطی،مقیمیؔ ، رستمی اور ولیؔ جیسے باکمال شاعروں نے قصیدہ گوئی کی روایت کوآ گے بڑھایا۔

لکھنؤ میں انشاؔء اور مصحفیؔ نے قصیدہ نگاری کو بال و پر عطا کیے۔ مرزا محمد رفیع سوؔدا قصیدہ نگاری کے آفتاب و ماہتاب تسلیم کیے جاتے ہیں ۔قصیدہ نگاری کا دوسرا اہم دور غالبؔ،ذوقؔ، مومنؔ اور داغؔ کے عہد کو کہا جاتا ہے اُس عہد کے شعرائے کرام میں ''خاقانیِ ہند'' شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

دبستانِ لکھنؤ سے متعلق شاعروں میں منیرؔ شکوہ آبادی،امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنؤ وغیرہ نے قصیدہ نگاری کے قافلے کوآ گے بڑھایا۔محسنؔ کاکوروی اور عزیزؔ لکھنوی نے نعتیہ قصیدوں کے ذریعہ اردو میں قصیدہ نگاری کو نئی آب و تاب بخشی ۔

قصیدہ نگاری چونکہ درباروں اور ریاستوں سے وابستہ تھی اس لیے راجا رجواڑوں بادشاہوں نوابوں اور رئیسوں کے خاتمے کے ساتھ ہی اس صنف کا بھی زوال ہوگیا۔اب اس کی حیثیت قصّۂ پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔لیکن اس سے کسی کوانکار نہیں ہوسکتا کہ علم وادب اور فنون لطیفہ کے فروغ میں قصیدہ نگاری کی حیثیت مضبوط کڑی جیسی رہی ہے۔

مرزا محمد رفیع سوؔدا

مرزا محمد رفیع نام،سوؔدا تخلص ۔سوؔدا کی ولادت ۱۷۱۲ء میں بمقام دہلی ہوئی۔آپ کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا، جوسوداگری کے لیےمشہور تھے۔سوؔدا نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص سوؔدا اپنایا۔آپ کے بزرگوں کا وطن بخارا و کابل تھا لیکن سوداگری اور تجارت کی غرض سے انہوں نے ترکِ وطن کر کے ہندوستان کو اپنا وطن ثانی بنایا۔

سوؔدا کی تعلیم وتربیت دہلی میں ہوئی آپ بڑے ذہین اورشوخ طالبِ علم تھےاس لیے کتابی علم پر مجلسی علم کو ترجیح دیتے تھے۔انہیں اپنے وقت کے مروجہ علوم وفنون خصوصاً عربی' فارسی اور ترکی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔جس وقت سوؔدا کے والد کا انتقال ہوا تب سودا بالغ ہو چکے تھے۔سوؔدا کے والد نے محنت ومشقت سے کمائی ہوئی بہت سی دولت ترکے کے طور پر چھوڑی تھی لیکن سوؔدا نے یار باشی اوراحباب پرستی میں سب کچھ لٹا دیا۔اسی لیے انہیں مجبوراً کبھی فوج میں نوکری کرنی پڑی اور کبھی مصاحب پیشہ ہونا پڑا۔پہلے پہل وہ محمد شاہ کے خواجہ سرا بسنت علی خاں کے ملازم ہوئے۔پھر سیف الدولہ احمد علی خاں اور ان کے بعد غازی الدین خاں عماد الملک سے وابستہ ہوئے۔جب دہلی میں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا تو سوؔدا دہلی سے فرخ آباد چلے گئے۔اورنواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہنچے۔آصف الدولہ نے انہیں ''ملک الشعرا'' کا خطاب دے کر چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔سوؔدا نے ۱۷۸۱ء میں اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

سوؔدا کو بچپن ہی سے شاعری کا ذوق وشوق تھا۔انہوں نے سب سے پہلے سلیمان قلی ودؔاد سے مشورۂ سخن کیا' پھر شاہ حاتؔم کے شاگرد ہوئے اور آخر میں خان آرزؔو سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے

کثرتِ مشق نے جلد ہی سوؔدا کو استادی کے مرتبے پر پہنچا دیا۔سوؔدا اردو کے مسلم الثبوت شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور میدان غزل میں بھرپور کمال دکھایا لیکن قصیدہ نگاری کو معراج کمال تک پہنچانے کے سبب آپ کی شہرت ومقبولیت میں اضافہ ہوا۔مرثیہ نگار کی حیثیت سے بھی سوؔدا کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

بحیثیت قصیدہ نگار اور ہجو نگار سوؔدا یکتا اور لاثانی نظر آتے ہیں۔ان کے قصیدے نازک خیالی' بندش کی چستی' الفاظ وتراکیب کی ندرت' تشبیہات واستعارات کی جدّت' فصاحت وبلاغت اور سلاست و روانی کے عمدہ نمونے قرار دیے جاتے ہیں۔مشکل زمینوں میں کہے گئے ان کے قصیدوں میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو کسی بھی قصیدے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہیں۔سوؔدا نے ہر قسم کے قصیدے کہے ہیں۔سوؔدا کا قصیدہ ''اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل'' حضرت علی کی منقبت کے بطور کہا گیا ہے۔یہ قصیدہ ''باب الجنت'' کے نام سے مشہور ہے۔اس قصیدے کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ سوؔدا کو حضرت علی کی ذاتِ والاصفات سے گہری عقیدت تھی۔حضرت علی کے فضل وکمال اور شجاعت وسخاوت کا تذکرہ سوؔدا نے جن پرشکوہ الفاظ میں سے کیا ہے اس کی داد دیتے ہوئے بنتا ہے۔یہ قصیدہ سوؔدا نے فارسی قصائد کی طرز اور زمین میں کہا ہے' کیونکہ فارسی شعرا عرفیؔ ،شیرازیؔ اور انوریؔ نے انھیں ردیف وقوافی میں سوؔدا سے قبل اپنے قصیدے پیش کیے تھے۔سوؔدا کے اس قدم کو ہم مستحسن قرار دے سکتے ہیں' کیونکہ ایک چراغ سے کئی دوسرے چراغ روشن ہوتے ہیں۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ

قصیدہ باب الجنت (درمنقبت حضرت علیؓ)

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل
تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر اک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ وجل

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کرتا پھل

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گلِ نو رُستہ کی رنگ آمیزی
پوششِ چھینٹ قلمکار بہرِ دشت وجبل

عکسِ گلبن پہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کار نقاشیِ مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بارِ آبِ رواں عکسِ ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ از بس کہ ہُوا ہے بے کل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئید گیِ خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

تیری قدرت بہ جہاں قدرتِ حق کی خاطر
خلق کے وہم غلط کار میں ٹھہرے ہے مثل

مرضیِ حق، تیری مرضی سے ہے جوں جو ہر فرد
اس یقیں میں نہ گماں کر سکے زنہار خلل

علم تیرا نہیں کچھ علمِ خدا سے باہر
ہے عمل بھی وہی تیرا، جو خدا کا ہے عمل

رائے تیری کے موافق، جو نہ لکھے نسخہ
کرے تاثیر نہ عیسیٰ کا مداوا، نہ کسل

سر کے پیکاں نہ قبضے سے کماں کے سرِ مو
ہو اشارہ جو ترا تیر قضا کو، کہ نہ چل

ٹک تری مرضی سے باہر جو کرے کام جہاں
ہاتھ سے، کام زمانے کے ہیں جائے بچل

معنیِ عِلت غائی، جونہ ہو، تو اُن کا　　خانۂ ہر دوجہاں پھر ہوں دو بیتِ مہمل
سایہ میں دست کرم کے ترے ہر صبح ومسا　　دولت ہر دو جہاں سے ہو غنی عبدِ اقل
دین و دنیا کی ہے اشیا سے کہیں وہ اعلیٰ　　ہووے جو شے تری اشیا میں سبھوں سے اسفل
جوگدا ہے بہ جہاں تیرے گدائے درکا　　اس کے درکا وہ گدا کہیے جسے اہل دَوَل
چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر　　نظم تجھ مدح کی بہترز کلام اوّل
برگ پیدا کرے تاباغ میں ہر ایک نہال　　پھوٹے تانامیہ سے شاخِ شجر میں کونپل
تاملے خلعتِ نَوروز بہ بستان جہاں　　پاوے تاثیّرِاعظم، شرف از بُرج حمل
تالب جو' پہ کرے' خیمہ کو استادہ حباب　　تابچھادے' بہ ردش سبزہ 'فروش مخمل
شاخ کے ہاتھ میں تاہو' بہ چمن ساغر گل　　گل کے جب تک رہے' غنچہ کی صراحی بہ بغل
تابہ مے خانہ' پییں بادۂ گلگوں مے خوار　　ساتھ مُطرب کے بجے تا' دف ونے' چنگ ودُہل
پھرے تاباغ میں' ہر اک روش پر' سرخوش　　راہ چلتے میں' قدم مست کا' تاجائے پھسل
مہ کے پرتوسے ہو' تاچاک گریبانِ کتاں　　گل سے خورشید کے' تاعشق رکھے دانۂ طل
قدرہو' عود کی تا' مجمر و آتش سے فزوں　　لطفِ بو' تارہے عالم میں بہ چوب صندل
تامسمیٰ رہے یہ نظم بہ باب الجنت　　جب تلک اس سے برآوے مری امیدواامل

نخلِ امید سے اپنے ہوں برومند محبّ
ہومحبت نہ تری جن کو' نہ پاویں وہ پھل

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

الفاظ	معانی
مروجہ	رائج، رواج کے مطابق چلی آرہی
علوم	علم کی جمع یعنی طرح طرح کے علم
فنون	فن کی جمع یعنی مختلف قسم کے فن
احباب	حبیب کی جمع یعنی دوست، عزیز، پیارا
مسلّم الثبوت	جو ثبوت کا محتاج نہ ہو، مانا ہوا
بازار گرم ہونا (محاورہ)	کسی چیز یا کیفیت وحالت کی زیادتی
لاثانی	بے مثال، بے نظیر، یگانہ، یکتا
ضمانت	ضامن، گواہ، شاہد
مستحسن	نیک، پسندیدہ، خوب، بہتر
باب الجنت	جنت کا دروازہ
مدح	تعریف، ثنا
منقبت	حضرت علیؓ، خلفاء راشدین اور دیگر بزرگان دین کی مدح کو منقبت کہتے ہیں
بہمن ودے	بہمن، چالاک، ذہین، برستا ہوا بادل دے، شمسی سال کا دسواں مہینہ، ماگھ
چمنستاں	پھلواری، گلزار، پھولوں کا قطعہ

عمل	کام، دھندا، کاروبار، تعمیل
تیغِ اُردی	تیغ، بمعنی تلوار یا شمشیر اُردی ایرانیوں کا دوسرا مہینہ جو ہندی جیٹھ کے مطابق ہوتا ہے
ملکِ خزاں	ملک، راج، ولایت، دیش، خزاں، پت جھڑ، فصل خریف
مستاصل	جڑ سے اکھڑا ہوا، برباد، تباہ
سجدۂ شکر	وہ سجدہ جو خدا کے حضور کسی بات کے شکرانے کے لیے کیا جائے
شاخِ ثمر دار	پھلوں سے لدی ڈالی یا ٹہنی
کرم عزّ وجل	اللہ کی عنایت و مہربانی
قوت نامیہ	بڑھنے کی قوت و طاقت
نباتات	نبات کی جمع یعنی سبزیاں، ترکاریاں
عرض	چوڑائی، پاٹ، گزارش، التماس
خلعت	وہ پوشاک جو بادشاہ یا امرا کی طرف سے بطور عزت افزائی ملے، تحفہ، عطیہ، تحسین،
نوروز	سال کا پہلا دن، ایرانیوں کا قومی جشن
آب جو	چشمہ، ندی، نہر کا پانی
قطع کرنا	کاٹنا، تراشنا، چھوڑنا
روش	طور، طریقہ، رفتار، ڈھنگ، چلن
گل نورستہ	نیا، تازہ اور نوخیز پھول
رنگ آمیز	رنگ سازی، نقاشی، مصوری

پوشش	لباس،غلاف
دشت وجبل	دشت بمعنی جنگل،صحرا،بیابان، جبل بمعنی پہاڑ
عکس گل بن	پھولوں کی پرچھائی،سایہ،پرتو
کارنقاشی	مصوری یانقش ونگار بنانے کا کام،گل کاری
مانی	(۲۱۶ تا ۲۷۶) کاایک مشہورومعروف نقاش جونبوت کا جھوٹا دعوی کرتا تھااورنقاشی کواپنا معجزہ بتا تا تھا۔
گہرہائے تگرگ	اولے یا ژالے کی صورت میں برسنے والے موتی
اشجار	شجر کی جمع یعنی بہت سے درخت،پیڑ
آبِ رواں	بہتا ہواپانی،ایک قسم کا باریک کپڑا
ہجوم گل	بہت سے پھول یعنی گلشن گلزار،چمنستاں
بےکل	بےچین،بےقرار،بےتاب
شمع ساں	شمع کی طرح روشن اورنورانی
گرمیِ نظارہ	حرارتِ دیدار
جوشِ روئیدگی	نباتات(ہریالی)کےاگنے یانمودارہونے کا جوش
گاوِزمین	قدیم خیال کے مطابق وہ بیل جس کے ایک سینگ پرزمین رکھی ہوئی ہے
قدرتِ حق	شان خداوندی،اللہ تعالیٰ کی طاقت
خَلق	دنیا کےلوگ،مخلوق آفرینش

وہم	شک، بے اعتباری، دماغ کی وہ قوت جو فاسد خیال پیدا کرتی ہے
مثل	جیسا، ملتا جلتا، ہم شکل، یکساں
مرضیِ حق	رضائے الٰہی، اللہ تعالیٰ کی مرضی
جوں	جیسے مانند، مثل
جوہرِ فرد	بے نظیر موتی، وہ جوہر جس کا ثانی نہ ہو
گماں	شک، بے اعتباری، وہم
زنہار	ہرگز، کبھی نہیں، خبردار
خلل	خرابی، رخنہ، سودا، دیوانگی
موافق	مطابق، یکساں، برابر، مشابہ
نسخہ	کاغذ کا وہ پرزہ جس پر طبیب دوا تجویز کرتا ہے
تاثیر	اثر، نتیجہ، پھل، خاصیت
مداوا	علاج، دوا، معالجہ، درماں، چارہ
کسل	سستی، کاہلی، تھکان، تھکاوٹ
پیکاں	برچھی یا بھالے کی انی، نیزے کی نوک
کماں	خمیدہ، لچک دار، قیادت، سرداری
سرِ مو	بال کے برابر، بال کے مانند
تیرِ قضا	قضا کا حملہ، موت
ٹک	ذرا، کچھ، تھوڑا
علت غائی	نتیجہ، مقصودِ اصلی، ماحصل، پھل

خانہ	گھر، مکان، بیت
ہر دو جہاں	دونوں جہاں، یعنی دنیا و عقبیٰ
دو بیت	دو اشعار یعنی چار مصرعے
مہمل	ترک کیا ہوا، بیکار، فضول، بے معنی
سایہ	چھاؤں، پرتو، حفاظت، حمایت، سرپرستی
دستِ کرم	عنایت و مہربانی کا ہاتھ
صبح و مسا	صبح و شام
غنی	آسودہ، دولت مند، مطمئن، بے نیاز
عبد اقل	عبد بمعنی بندہ، غلام، ملازم، خادم اقل بہ معنی بہت تھوڑا، کم سے کم، قلیل ترین
اشیا	شئے کی جمع یعنی چیزیں
اسفل	نہایت نیچا، ادنیٰ
گدا	فقیر، بھکاری، منگتا
در	چوکھٹ، دروازہ
اہلِ دَوَل	دولت مند، مال دار
دعائیہ	دعا سے منسوب، قصیدے کے وہ اشعار جو بطور دعا کے کہے جاتے ہیں
برگ	پتہ، ورق
نہال	تازہ لگایا ہوا پودہ، خوش و خرم

تا	تک، تا کہ، جب تک
شاخِ شجر	درخت کی ٹہنی یا ڈالی
لبِ جو	ندی کا کنارہ
خیمہ	ڈیرہ، تنبو، خرگاہ
استادہ	کھڑا ہوا
حباب	پانی کا بلبلہ
روش سبزہ	چمکتی ہوئی شادابی یا ہریالی
فروش مخمل	مخمل کی فرش، مخملی زمین
ساغرِ گل	پھولوں بھرا شراب کا پیالہ
بہ بغل	بغل یا پہلو میں
مے خانہ	شراب خانہ، میکدہ
گلگوں	گلاب کی طرح، سرخ رنگ کا
مے خوار	میکش، شراب پینے والا، بادہ کش
مُطرِب	گانے والا گویّا
دف و نے	دف: ایک ہاتھ سے بجانے والا ساز، نے بانسری
چنگ و دُہل	ڈھول، نقارہ، ستار کی قسم کا ایک باجہ
سرخوش	خوش حال، مسرور، مگن
مہ	چاند، قمر، ماہتاب
کتاں	ایک قسم کا باریک کپڑا، جس کی نسبت مشہور ہے

کہ چاندنی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے

خورشید	سورج، آفتاب، مہر
دانہ طِل	سونے کا دانہ سنہری دانہ
عُود	ایک قسم کی عمدہ لکڑی جو آگ میں جل کر عمدہ خوشبو دیتی ہے
مُجمِر و آتش	وہ برتن جس میں خوشبودار چیزیں جلاتے ہیں، عوددان
فزوں	زیادہ، بڑھا ہوا
لطفِ بو	خوش بو کی لذت یا مزہ
چوب صندل	صندل کی لکڑی
مسمّٰی	موسوم کیا گیا، نام رکھا گیا، پکارا گیا
امید و امل	آرزو، خواہش، تمنا
نخلِ امید	امید یا خواہش کا درخت
برآوے (محاورہ)	حاصل ہونا، پورا ہونا
برومند	پھل پانے والا، فائدہ اٹھانے والا
محبّ	محبت کرنے والا، مشفق، شفیق

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ قصیدہ ''اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل'' کس کی مدح میں لکھا گیا ہے؟

۲۔ سوداؔ کا پورا نام لکھیے۔

۳۔ قصیدہ ''اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل'' کس نام سے مشہور ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ سوداؔ نے اپنا تخلص سوداؔ کیوں رکھا تھا؟

۵۔ مانی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۶۔ لفظ ''خورشید'' کے مترادف الفاظ لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بتائیے۔

۸۔ سوداؔ کے حالات زندگی تحریر کیجیے۔

محمد ابراہیم ذوقؔ

شیخ محمد ابراہیم نام، ذوقؔ تخلص۔ ۱۷۸۹ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ذوقؔ کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو سپاہی کے عہدے پر مقرّر رہتے۔ ذوقؔ کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول شوقؔ کے مکتب میں ہوئی۔ حافظ صاحب چونکہ خود بھی شاعر تھے اس لیے ان کے یہاں شعر وسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم ذوقؔ کو بھی بچپن سے شاعری کا چسکا لگ گیا۔ وہ اپنے کلام پر حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لینے لگے اور استاد کے تخلص کی رعایت سے ذوقؔ تخلص اپنالیا۔

حافظ غلام رسول شوقؔ کے مکتب سے تعلیم مکمّل کرکے ذوقؔ مولوی عبدالرزّاق کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں ذوقؔ کی ملاقات مولانا محمد باقر اور میر کاظم حسین بےقرارؔ سے ہوئی اور چند دنوں میں ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ چونکہ میر کاظم حسین شاہ نصیرؔ دہلوی کے شاگرد تھے، اس لیے ذوقؔ نے بھی نصیرؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کرلی۔ اب ذوقؔ کی شاعری کو پر لگنے لگے۔ ۱۹/ برس کی عمر میں ذوقؔ کی رسائی آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ تک ہوگئی۔ ظفرؔ نے ذوقؔ کی صلاحیتوں سے متاثّر ہوکر انھیں اپنا استادِ سخن بنالیا۔

ذوقؔ کی شاعرانہ شخصیت کے پیشِ نظر اکبر شاہ ثانی نے انھیں ''خاقانیِ ہند'' اور بہادر شاہ ظفرؔ نے ''ملک الشعراء'' کے خطاب سے نوازا۔ ذوقؔ نے اپنے بیش تر قصیدے بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں کہے ہیں۔ عجز وانکساری، قناعت پسندی اور درویش صفت طبیعت کے مالک ذوقؔ کا انتقال ۱۵/ اکتوبر ۱۸۴۵ء کو بمقام دہلی ہوا اور ذوقؔ دہلی میں ہی پیوندِ خاک ہوئے۔

ذوقؔ بلند پایہ شاعر تھے، انھوں نے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن انھیں قصیدہ نگار کی

حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔ ذوقؔ کے قصیدے الفاظ و معنی کا بھر پور ذخیرہ ہیں۔ ان کی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے یہ قصیدے مضحکہ خیز نہیں ہوتے۔ الفاظ کی بندش، زبان کی صفائی، محاوروں کا برمحل استعمال اور علمی اصطلاحات نے ذوقؔ کے قصیدوں کو پُر وقار بنا دیا ہے۔ ذوقؔ کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فن موسیقی علمِ نجوم، علمِ فقہ، علمِ طب، فلسفہ، حدیث اور تاریخ وغیرہ میں بھی قدرت حاصل تھی۔ ذوقؔ نے سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں قصیدے کہہ کر اپنی شاعری کا لوہا منوا لیا ہے۔ اُن کے دیوان اور کلّیات شائع ہو چکے ہیں جن میں دیگر اصناف کے ساتھ قصیدوں کی خاصی تعداد ہے۔

ذوقؔ کا قصیدہ ''ساون میں دیا پھر مہ شوّال دکھائی'' بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں کہا گیا ہے۔ اس قصیدے کا شمار ذوقؔ کے بہترین قصیدوں میں ہوتا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں ذوقؔ نے ساون کے مہینے کی رِم جھم کا پُر سرور اور پر کیف منظر دکھایا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ عید کے چاند کی خوشی موسم کی خوش گواری کے سبب دوبالہ ہوگئی ہے۔ ہوا کی تاثیر اور باغ کی آرائش کا بیان ذوقؔ کی قوّتِ شاعرانہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

اس قصیدے کی گریز اور مدح کے اشعار بھی قابل تعریف ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اے بادشاہ تیرے دیدار سے مشرّف ہو کر تمام عالم عید منا رہا ہے۔ ہم جسے عید کا چاند کہتے ہیں دراصل وہ تیرے ابرو کا عکس ہے تیرے مقام و مرتبے کا یہ عالم ہے کہ بادشاہ جمشید اپنی بزم عیش و عشرت کو تیرے عکس سے ادھار لے کر رونق بخشتا ہے۔

قصیدے کے آخر میں ذوقؔ اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفرؔ کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے بہادر شاہ میں ٹھیک طرح سے یا مکمّل طور پر تیری تعریف نہیں کر سکا۔ اے بادشاہ تیری جلوہ نمائی اور دیدار ہمیں اسی طرح شان و شوکت کے ساتھ ہر عید کے موقع پر ہوتے رہیں۔ تیری رعایا ہمیشہ تجھ سے فیض یاب ہو اور تو اسی طرح مسند شاہی پر جلوہ افروز ہو کر اس کی رونق بڑھاتا رہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفرؔ

ساون میں دیا، پھر مہِ شوّال دکھائی
برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال، ابروئے پُر خم سے اِشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طِلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مےَ سُرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ، نہ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی، تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ مُمیّز، کُرّۂ ناری و مائی

پہنچا کمک لشکر باراں سے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہر قلزم عمّاں پہ لب جو، مُتبسّم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی، جو زمیں پائی

سردیِ حنا پہنچے ہے، عاشق کے جگر تک
معشوق کا گھر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے، کہ تاثیرِ ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرفِ ہوا ہے طرب و عیش کا عالم
ہے مدرسہ میں بھی، سبقِ صرفِ ہوائی

خالی نہیں مےَ سے، روشِ دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیحِ ریائی

جو آئینۂ دل ہے، وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینائے مے کاہ رُبائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشائی
کرتی ہے نسیم آکے، کبھی لخلخا سائی

تھا سوزنیِ خار کا، صحرامیں جہاں فرش
سبزہ نے وہاں مخملِ خوش رنگ بچھائی

شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے ابرو نے وہ تیری
کی آئینۂ چرخ میں ہے عکس نمائی

پرتو سے تیرے جام مئے عیش سرِ بزم
لے ساغرِ جمشید کرے کارِ روائی

ٹپکے لب ساغر سے ، وہ قطرکر دی شکل
ہو مثلِ فلک جس میں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا، سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہو سکے، کاسہ میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
احسنت کہیں سن کے ، بہائی وسنائی

یوں کرسیِ زر پر ہے تیری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو، سرِ رحل طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بہ کف، از بہر گدائی

گمرہ کو ہدایت ، جو تیری راہ پہ لائے
رہزن بھی اگر ہو، تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخن تدبیر
دشمن کی ترے ہو، نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو، نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے، در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رُخِ روشن سے تیرے جوں یدِ بیضا
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جو ہر کے رہے تیغ ہمیشہ
خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوقؔ کو مضمون ثنا میں
ہے ذہنِ رسا کو، یہ کہاں اس کے رسائی

ہر سال شہا! ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
آراستہ	سجا ہوا، سنوارا ہوا
رعایت	لحاظ، خیال، مناسبت
خطاب	تعریف کے طور پر اچھّا نام، کسی بادشاہ یا حکومت کی طرف سے دیا گیا اعزازی نام
بلند پایہ	عالی مقام، عالی رتبہ
جملہ	تمام، کُل
مضحکہ خیز	ہنسی مذاق میں ڈالنے والی بات
برمحل	وقت یا موقع کے عین مطابق
علمِ نجوم	ستاروں کا علم
علمِ فقہ	علمِ دین، شریعت کا علم
سنگلاخ	مشکل، دُشوار، پتّھر جیسی سخت
لوہا منوانا (محاورہ)	کسی کی اُستادی کا قائل ہونا، کسی کو اپنے سے بڑا ماننا
کلیّات	کل کی جمع یعنی ایک ہی شخص کی منظومات یا تصنیفات کا مجموعہ
مشرّف	معزّز، عزّت بخشا گیا
جلوہ افروز	خاص بناؤ سنگھار یا سج دھج کے ساتھ سامنے آنا،

کسی مخصوص انداز کے ساتھ نمودار ہونا

مہِ شوّال	عید کا چاند، دسواں قمری مہینہ
قدح کش	شراب پینے والا
ہلال	چاند
ساقی	شراب پلانے والا
بادہ	شراب
کشتیِ طلائی	سنہری سونے کی کشتی یعنی شراب کا پیالہ
جامِ بلوری	بلوری (صاف شفاّف پتھّر) کا پیالہ جس میں شراب پی جاتی ہے
مےِ سُرخ	سُرخ شراب
مے کش	شراب پینے والا
حنائی	مہندی کا رنگ یعنی سُرخ رنگ
مےِ تیز	تیز شراب
باراں	بارش
ممیّز	ایک چیز کے مقابل میں دوسری چیز میں فرق ہونا
کُرۂ ناری و مائی	آگ اور بجلی
قلزمِ عماّں	ایک نہر کا نام
متبسّم	مسکرانے والا
چشم نمائی	آنکھیں دکھانا
کافور	کپوُر۔ نام ایک خوشبو کا۔ بہشت کا ایک ٹھنڈا چشمہ

دستِ حنائی	ہاتھ کی مہندی
گردوں	آسمان
طرز	مجازاً باغ کی پڑی
زاہد	عبادت گزار
تسبیح ریائی	دکھاوے کی تسبیح
کاہِ ربائی	ایک چشمہ جو ہوا لگنے سے جم جاتا ہے
مشک فشانی	خوشبو پھیلانا
لخلخہ سائی	مختلف خوشبوؤں کو بکھیر دینا
سوزنی خار	کانٹوں کا جال
پرتو	عکس
ساغر جمشید	بادشاہ کا ساغر (شراب کا پیالہ)
کاسہ	پیالہ
احسنت	بہت خوب
مصحف	قرآن شریف، آسمانی کتابیں
رحل	لکڑی کی رحل (جس پر قرآن شریف رکھ کر تلاوت کرتے ہیں)
دستِ سخا	سخی ہاتھ، بخشش
بحر	دریا
بکف	ہاتھ پھیلانا
واسطے	لیے

گدائی	مانگنا
عقدہ کشائی	راز جاننا
افزوں	زیادہ
ناصیہ سائی	سجدے کرنا
یدِ بیضا	ہاتھ روشن اور سفید
اعجاز نمائی	کرشمہ دکھانا
سیمرغ	ایک پرندہ، عنقا جو بہت اونچائی پر ہو
مانع	منع کرنے والا، روکنے والا
عدل	انصاف
خونریز	خون گرانے والا، خونی
ثناء	تعریف
رسا	پہنچنے والا
رسائی	پہنچ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ''مہِ شوّال'' کسے کہتے ہیں؟

۲۔ قصیدہ ''ساون میں دیا پھر مہِ شوّال دکھائی'' کس کی مدح میں لکھا گیا؟

۳۔ بہادر شاہ ظؔفر نے ذوقؔ کو کس خطاب سے نوازا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ لفظ ''خوں ریز'' کے دو مترادف الفاظ لکھیے۔

۵۔ لفظ ''ہلال'' کے دو متضاد الفاظ لکھیے۔

۶۔ ذوقؔ کی تاریخِ ولادت و وفات مع مقام تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ قصیدہ ''ساون میں دیا پھر مہِ شوّال دکھائی'' کے ابتدائی پانچ اشعار کی تشریح کیجیے۔

۸۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی تحریر کیجیے۔

ڈاکٹر قائد علی خاں

مرثیہ
تعریف و تاریخ

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے معنی کسی مرنے والے کی تعریف اور توصیف کر کے اس پر غم کا اظہار کیا جاتا ہے۔اردو میں بیشتر مرثیے حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا پر لکھے گئے ہیں۔اسلامی تاریخ میں کربلا کا واقعہ ایک بڑا سانحہ ہے جس میں پیمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کے پیارے نواسوں اور ان کے رفقا کی شہادت کا دردانگیز اور پُر آشوب واقعہ پیش آیا۔اسی دردناک اور الم ناک واقعہ کو مرثیہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔اردو میں مرثیہ کا آغاز دکن سے ہوا۔

ڈاکٹر رشید موسوی نے برہان الدین جانمؔ کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے۔قلی قطب شاہ جو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے اور جس کے دیوان میں پانچ مرثیے شامل ہیں بعض مؤرخین نے قلی قطب شاہ کو ہی پہلا مرثیہ گو تسلیم کیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے مرثیے عرب میں دورِ جاہلیت میں لکھے گئے اس کے بعد ایران میں مرثیہ گوئی کو فروغ ملا جہاں محتشم کاشی اور ملا مقبلؔ نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔اردو میں مرثیے کے نقوش زبان کی ابتدا سے ہی ملتے ہیں۔دکن میں عادل شاہی،قطب شاہی اور نظام شاہی حکومتوں کے دور میں مرثیہ گوئی کا خوب رواج تھا۔دکن کے کم و بیش ہر چھوٹے بڑے شاعر نے سانحۂ کربلا پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔شمالی ہند میں فضلی نے اردو نثر کی پہلی تصنیف ''کربلا کتھا'' میں بھی واقعاتِ کربلا پیش کیا ہے۔شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد میں جو مرثیے لکھے گئے ان میں مسکینؔ،حزیںؔ اور غمگینؔ وغیرہ کے نام

قابلِ ذکر ہیں۔ دہلی میں میرؔ اور سوداؔ نے اپنی عمر کے آخری دور میں لکھنؤ آ کر بڑے جوش اور عقیدت سے لبریز مرثیے کہے۔ سوداؔ نے کل ۷۲ مرثیے لکھے ہیں۔ انہوں نے مرثیہ میں سب سے پہلے مسدس کی ہئیت (Form) استعمال کی جو بعد میں مرثیوں کے لیے مخصوص ہوگئی۔ میرؔ نے بھی اپنے مرثیوں میں شہادت کے پہلو کو بخوبی پیش کیا ہے۔

شمالی ہند میں میرؔ اور سوداؔ کے بعد تقریباً ہر شاعر نے مرثیے کہے ہیں۔ لکھنؤ میں میر حسنؔ، میر امانؔ، درخشاںؔ، صبرؔ وغیرہ نے بھی اردو مرثیہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ یہاں قابلِ ذکر ترقی میر ضمیرؔ کے ہاتھوں ہوئی۔ ضمیرؔ نے نہ صرف واقعاتِ کربلا کو شاعرانہ استدلال کے ساتھ پیش کیا بلکہ اس میں فنّی لوازمات یعنی اجزائے ترکیبی بھی متعین کیے جو بعد میں اردو مرثیہ نگاری میں لازمی قرار دیے گئے۔ اسی دور کے ناموراور مقبول شعرا میں خلیقؔ اور فصیحؔ بھی تھے جنہوں نے اردو مرثیے میں اضافہ کیا۔ ضمیرؔ، خلیقؔ اور فصیحؔ کا عہد لکھنؤ کا عروج تو نہیں کہا جا سکتا لیکن مرثیہ نگاری کی سب سے تابناک دور کی ہمواری کا دور کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہ زمانہ لکھنو میں نوابوں کا زمانہ تھا جو فرقہ امامیہ (شیعہ) کے پیرو تھے اور جو حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا سے بے حد محبت وعقیدت رکھتے تھے اس لیے مرثیہ نگاروں کو درباری سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔

لکھنؤ میں اردو مرثیہ نگاری کا ایک اہم دور میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ سے شروع ہوا جسے اردو مرثیہ کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ اس وقت مرثیے کی ترقی یافتہ شکل ان کے سامنے تھی لیکن دونوں شعرا نے جوش وعقیدت کے والہانہ پن، خیالات کی جدّت، زورِ بیان، فصاحت و بلاغت، نادر تشبیہات، استعارات، چست الفاظ، محاوروں کے ساتھ جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور مناظرِ فطرت کے اعلیٰ نمونے پیش کر اردو مرثیہ کو بامِ عروج عطا کیا۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد پیارے صاحب رشیدؔ کا نام آتا ہے جنہوں نے مرثیوں میں 'ساقی نامہ' اور بہاریہ کلام پیش کیا۔ شادؔ نے تصوف و الٰہیات کے مضامین

باندھے۔ اس کے علاوہ مونسؔ ، گداؔ، افسردہؔ، حیدریؔ، سکندرؔ، نفیسؔ، وحیدؔ، اوجؔ، چھنو لال دلگیرؔ اور فصیحؔ وغیرہ نے بھی مرثیہ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

عام طور پر مرثیے واقعاتِ کربلا اور حضرت امام حسینؓ یا ان کے اعزہ ورفقا کی شہادت کے موضوع پر کہے جاتے ہیں لیکن اردو میں شخصی، قومی اور غیر مذہبی مرثیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جہاں تک شخصی مرثیوں کی بات ہے تو اس سلسلے میں حالیؔ، اقبالؔ، سرورؔ جہاں آبادی، چکبست، صفیؔ لکھنوی وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے مختلف علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کی وفات پر اپنے جذباتِ غم کا اظہار کیا ہے۔

شخصی مرثیوں میں مولانا حالیؔ کا ''مرثیۂ غالبؔ'' اور علامہ اقبالؔ کا ''مرثیۂ داغؔ'' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں مرثیے اپنے اساتذہ کی وفات پر لکھے گئے، جن میں اپنے غم اور قلبی واردات کو بڑی عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شاملِ نصاب مرثیہ موسوم بہ ''مرثیۂ غالبؔ'' اردو کے شاہکار شخصی مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ جو غالبؔ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور آپ کے شاگرد کے ساتھ بڑے اچھے دوست بھی تھے۔ جب بھی دہلی میں رہے غالبؔ کی صحبت سے فیض اٹھاتے۔ حالیؔ اپنے استاد غالبؔ اور ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ جب ۱۸۶۹ء میں غالبؔ کے انتقال کی خبر ہوئی تو انھیں اپنے فاضل استاد کی موت کا گہرا صدمہ ہوا چنانچہ انہوں نے اپنے غم اور صدمہ کا اظہار اس مرثیہ کی شکل میں کر کے غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

میر انیسؔ

میر ببر علی نام انیسؔ تخلص تھا۔۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر خلیقؔ کے فرزند اور میر حسنؔ کے پوتے اور میر ضاحکؔ کے پر پوتے تھے۔ گویا انیسؔ کو شاعری ورثہ میں ملی۔ آپ کے دادا میر حسنؔ اپنی مثنوی ''سحر البیان'' کے لیے بہت مشہور ہیں۔ آپ کے والد خلیقؔ بھی اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انیسؔ نے ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی سے اور عربی کا درس میر عباس سے لیا۔ گھر میں ہر وقت شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے لہٰذا اس ماحول کا اثر انیسؔ پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ میر انیسؔ نے اوائل عمری سے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اپنے والد سے اصلاح لی پھر والد کے کہنے پر امام بخش ناسخؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ ابتدا میں میر انیسؔ کا حزیںؔ تخلص تھا بعد میں ناسخؔ کی ناپسندیدگی کے سبب انیسؔ اختیار کیا۔

میر انیسؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن اپنے والد کی اصلاح پر بہت جلد اس سے کنارہ کر سلام اور مرثیوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ انیسؔ نے پہلا سلام نو سال کی عمر میں کہا۔ جوانی کے زمانے میں ان کا پورا خاندان لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوا۔ اور یہیں تا عمر انیسؔ نے اپنی شاعری کے جوہر دکھائے۔ جب تک لکھنؤ آباد رہا میر انیسؔ یہاں سے کہیں نہیں گئے جب لکھنؤ اجڑا تو وہ پٹنہ، بنارس، الہ آباد اور حیدر آباد بھی گئے اور ہر جگہ ان کی قدر و منزلت ہوئی۔

انیسؔ ورزش کے بہت شوقین تھے انہوں نے فن شہسواری اور سپہ گری کی بھی تعلیم حاصل کی۔ جو ان کی شاعری میں کافی مددگار ثابت ہوئی۔ وہ مزاج کے اعتبار سے بڑے خلیق اور وضع دار انسان تھے۔ خودداری کے سبب اکثر امیروں سے ملنے میں اجتناب کرتے تھے۔ کبھی کسی کی خوشامد میں شعر نہیں کہے۔ محمد حسین آزادؔ نے 'آبِ حیات' میں میر انیسؔ کے مرثیوں کی تعداد کم سے کم دس ہزار بتائی ہے۔ جب کہ

امیر احمد دہلوی نے یادگارِ انیسؔ میں مراثی کی کل تعداد چودہ سو بتائی ہے۔ڈاکٹر صفدر حسین نے ان کی تعداد دوسو پچاس بتائی ہے شاید یہ تعداد ان کے مطبوعہ کلام کی ہو۔ بہر کیف میر انیسؔ نے کثیر تعداد میں مرثیہ کہے ہیں۔ انیسؔ کے مرثیوں کی چار ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

انیسؔ نے مرثیوں کے علاوہ غزلیں، رباعیات، قطعات اور سلام بھی خوب کہے ہیں۔ بالخصوص رباعیات بڑی پایہ کی کہی ہیں مگر ان کو اصل شہرت مرثیوں کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ میر انیسؔ نے اردو مرثیہ میں تمام فنی لوازمات کو کمالاتِ فن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے مرثیوں میں فصاحت و بلاغت کا عنصر ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ فارسی تراکیب اور محاوروں کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ صنائع بدائع نیز رعایتِ لفظی ان کی شاعری کی جان ہیں۔وہ الفاظ کو شعروں میں اس طرح پروتے ہیں کہ اس کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔وہ شاعری میں مصوری سے کام لیتے ہیں۔تصویر بھی ایسی بناتے ہیں جو حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔مناظرِ فطرت کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں گویا قاری اس منظر کو آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے۔ رزم و بزم کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والے پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ بقول خود ؎

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے بھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

کلام میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال شاعرانہ کمال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثلاً ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اس شعر میں اوس کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے جو فصاحت سے لبریز ہے۔

انیسؔ کے کلام میں تصنع یا بناوٹ نام کو نہیں ہے۔ان کے مرثیوں کے کردار عرب سے تعلق رکھتے ہیں۔مگر ان کے طور طریق (رہن سہن) ہندوستانی ہیں۔انیسؔ کی شاعری جذبات کا حقیقی آئینہ ہے۔

انہوں نے اپنے مرثیوں میں اعلیٰ انسانی قدروں مثلاً محبت، سخاوت، شجاعت وغیرہ کو بے مثال ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ رزمیہ شاعری میں وہ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔

انیس کے مرثیوں میں منظر نگاری پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مناظرِ فطرت کے بیان میں وہ یکتا نظر آتے ہیں چاہے صبح وشام کا منظر ہو، سردی یا گرمی کا بیان ہو، میدانِ کربلا میں جنگ اور شہادت کا منظر ہو۔ گویا ہر منظر نرالی شان کے ساتھ بیان کیا ہے ایک جگہ صبح کے منظر کا یہ عالم دیکھیے۔

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی ہے
صاف غنچوں کے چٹخنے کی صدا آتی ہے

جذبات نگاری میں انیس کو خاص مہارت حاصل تھی۔ وہ واقعۂ کربلا کے ہر موقع پر ہر فرد سے چاہے وہ آقا ہو یا غلام، دوست ہو یا دشمن، بچہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت ہر ایک سے ویسی ہی بات کہلاتے ہیں جو فطرت کے عین مطابق ہو۔ انیس نے جذبات کی مختلف کیفیات اور مدارج کا لحاظ رکھتے ہوئے جذبات اور احساسات کی عمدہ نظیریں پیش کی ہیں۔

میر انیس نے اپنے مراثی میں کردار نگاری میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ واقعۂ کربلا میں جن ہستیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ان کی سیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انیس کی خوبی یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں یکسانیت کے باوجود انفرادیت نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہر کردار کو اس کے مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کیا ہے یعنی وہ کردار ماں، بہن، بیٹی، بہو، مالک یا نوکر ہے تو وہ کردار اسی مکمل شکل میں نظر آتا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں میں تمام اجزا کا بیان ترتیب اور تسلسل کے ساتھ ہوا ہے۔ انیس کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ چاہے کردار نگاری ہو، جذبات نگاری ہو یا رجز، شہادت یا بین ہو ہر ایک جُزو کو اور ان سے جڑے واقعات کو اس تسلسل اور خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کا ذہن آگے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور وہ اس واقعہ کو پوری دلچسپی اور تجسّس سے پڑھتا ہے اور یہی چیز ان کے مراثی کو عظمت بخشتی ہے۔

میر انیسؔ

مرثیہ

امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی

فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے
سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم، کہ جہاں زیر و زبر ہے
گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بہ سر ہے

گل رو صفت غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورت گلدستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہر سفر سرو صبا پوش
عمامے سروں پر ہیں عبائیں بسر دوش
یاران وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش
حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش

منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباسؓ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ
اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر ید اللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؓ کے ہوا خواہ
واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جانکاہ

ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ اُنس، یہ خُلقِ حسنیٰ کون کرے گا

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ہر قلب حزیں ہے، تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم

خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؐ کے
روضہ پہ اداسی ہے رسولِ عربیؐ کے

تدبیر سفر میں ہیں ادھر سبطِ پیمبر
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباس دلاور
تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبر

شہ کو جنہیں لے جانا ہے، وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل، چلے آتے ہیں گھوڑے

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلم کا خط آ لے تو کریں کوچ کی تدبیر
لِللّٰہ ابھی قبر پیمبر کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سِن میں مسافر انھیں ہونا
کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے، ماں ہاتھ ملے گی

ہے روح پہ اماں کی قلق کرتی ہیں زاری
سر پیٹتے میں نے انہیں دیکھا کئی باری
روداد بیاں کر گئی ہیں مجھ سے وہ ساری
فرماتی تھیں بھائی سے خبر دار میں واری
غم خوار ہے تو اور خدا حافظ جاں ہے
نہ باپ ہے سر پر مرے بچے کے نہ ماں ہے

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ پکارے شہِ عادل
تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج ومحمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل
رُخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے
بچّے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رُخصت کرو ان کو جو کہ ہیں ملنے کو آئے
کہہ دو کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے
جانے کی خبر میری نہ صغرا کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے نہ دم اس کا نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھ تو کھولو
کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اٹھ کہ بغل گیر تو ہولو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رولو
تم جس کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
گھر بھر میں جو ڈھونڈوگی تو اکبر نہ ملے گا

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار
پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار
تبرید فقط آپ کا ہے شربت دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر
نہ فرش، نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
اجڑا ہوا لوگو! نظر آتا ہے مجھے گھر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبطِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

کس سے کہوں اس درد کو میں بے کس و رنجور
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور
ہمراہیِ بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر، رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
فرزندِ پیمبر	پیغمبر محمدؐ کی اولاد، آلِ رسولؐ
سادات	حضرت علیؓ کی اولاد
زیروزبر	اوپر نیچے
چاکِ گریباں	گریبان کا پھٹا ہونا
خاک بہ سر	سر پر مٹی ہونا
صفتِ غنچہ	کلی کی صفت
کمربستہ	موجود، حاضر
آراستہ	مراد تیار (سامان کے ساتھ)
بہرِ سفر	سفر کے واسطے
سروقبا پوش	لمبے قد والے اچکن پہنے ہوئے
عمامے	صافے
عبائیں	جبہّ، چغے
دوش	کاندھا
ہم آغوش	گلے ملنا
تصویرِ یداللہ	اللہ کے ہاتھوں کی تصویر

صدمۂ جانکاہ	جان نکالنے والا صدمہ،غم انگیزی
شیریں سخن	میٹھی اور عمدہ باتیں،بہترین شاعر
اُنس	محبت،لگاؤ
خُلقِ حسنیٰ	خوش اخلاقی
قلبِ حزیں	غمگین دل
پُرنم	بھیگی ہوئی
دل بر	پیارا محبوب
مخدومۂ عالم	دنیا کی خدمت کی گئی
روضہ	قبر
سبطِ پیمبر	پیمبرِ اسلام کے نواسے (حضرت امام حسنؓ و حسینؓ)
یاور و انصار	دوست و احباب
ہودج	محمل،اونٹ کا کجاوہ
شہِ ذی جاہ	بلند مرتبہ والے (حضرت امام حسینؓ)
شبیر	حضرت امام حسینؓ کا لقب
ہم شیر	بہن
قلق	افسوس،رنج
روداد	قصہ،حالت،حقیقت
شہِ عادل	انصاف کرنے والا بادشاہ
بغل گیر	گلے لگنا (محاورہ)

شیدا	عاشق،خدا
اسباب	سامان (سبب کی جمع)
مسند	تکیہ لگا کر بیٹھنے کی جگہ
گہوارہ	پالنا
تبرید	ٹھنڈا کرنا،ٹھنڈائی
فقط	صرف،اکیلا،محض
تپ	بخار
بیکس	لاچار،محتاج
رنجور	غم گین
ہمراہی	ساتھی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ مرثیہ 'حضرت امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی' کے شاعر کا نام بتایئے۔

۲۔ میر انیسؔ اور میر ضاحکؔ کا کیا رشتہ تھا؟

۳۔ میر حسن کی مشہور مثنوی کا نام بتایئے۔

مختصر سوالات:

۴۔ اردو کے چند مشہور مرثیہ نگاروں کے نام بتایئے۔

۵۔ مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کے معنی بتایئے۔

تقصیر۔ تربت۔ سبطِ پیمبر۔ ہودج۔

۶۔ مندرجہ ذیل کے حضرت امام حسینؑ سے کیا رشتے تھے؟

حضرت صغراؓ۔ حضرت علی اکبرؓ۔ حضرت عباسؓ۔ حضرت فاطمہؓ۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ میر انیسؔ کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے اور ان کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات بتایئے۔

۸۔ اس مرثیہ کے پہلے اور دوسرے بند کی تشریح کیجیے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

الطاف حسین نام، حالؔی تخلص تھا۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایزد بخش کا انتقال اس وقت ہوا جب حالؔی کی عمر نو سال تھی۔ ان کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی ہرات سے ہندوستان اس وقت آئے جب غیاث الدین بلبن کی بادشاہی تھی۔ وہ پانی پت کے قاضی مقرر ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد حالؔی کی پرورش اور تعلیم کا ذمہ بہن بھائیوں نے اٹھایا۔ دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم عربی فارسی سے کی اور پھر حفظ قرآنِ پاک کی سعادت حاصل کی۔ حالؔی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا موقع نہ ملا۔ تعلیم سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کی شادی مرضی کے خلاف کر دی گئی ۔آخر کار پریشانی کے عالم میں دہلی کا رخ کیا۔ یہاں مولوی نوازش علی سے عربی کی تعلیم لی۔ رشتہ داروں کے کہنے پر واپس پانی پت آئے۔ غدر کے دوران پانی پت میں ہی دو چار سال گزارے اس دوران منطق وفلسفہ کے ساتھ فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کی۔

دہلی میں قیام کے دوران مرزا غالبؔ سے ملاقات کی اور انھیں اپنی غزلیں دکھاتے تھے اس طور پر حالؔی کو غالبؔ کی شاگردی کا شرف ملا۔ جب بھی دہلی جاتے غالبؔ کی صحبت سے فیض اٹھاتے تھے۔

حالؔی کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے بھی ہوئی تو ان سے دوستی ہوگئی اور ان کے بچوں کو پڑھانے کے لیے جہاں گیر آباد چلے گئے۔ یہاں کچھ اطمینان وسکون کے گزارے۔ نواب شیفتہؔ کے انتقال کے بعد حالؔی لاہور چلے گئے یہاں انھیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں کی عبارتوں کو درست کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح حالؔی کو انگریزی ادب سے قریب ہونے کو موقع ملا۔ چار سال تک یہ کام بخوبی انجام دیتے رہے اسی دوران محمد حسین آزاد کے جدید خیالات سے متاثر ہو کر چار نظمیں بعنوان

’برکھارت‘، ’نشاطِ امید‘، ’مناظرۂ رحم وانصاف‘ اور ’حبِ وطن‘ لکھیں۔ یہ نظمیں عام روایت سے ہٹ کر تھیں اس لیے ان نظموں سے اردو میں جدید رجحانات کی شروعات ہوئی۔

اسی دور میں مولانا حالیؔ نے سرسید سے ملاقات کی اور انھوں نے علی گڑھ تحریک میں اپنا تعاون پیش کیا۔ حالیؔ سرسید کے رفقا میں شمار ہونے لگے۔ سرسید کے اصرار پر انھوں نے ’مسدس مدوجزر اسلام‘ تصنیف کی جو سرسید کو بہت پسند آئی اس نظم کے ذریعہ حالیؔ نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم اردو کی مقبول ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا حالیؔ نے ۱۸۹۳ء میں جب اپنا دیوان شایع کرایا تو اس میں مقدمہ پیش کیا جس میں اردو شاعری اور اس کی جملہ اصناف پر اپنے قیمتی مشورے اور تنقیدی نظریات پیش کیے جو اردو میں اس سے پہلے ان خیالات کو اس طرح پیش نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ بعد میں اس مقدمہ کو ’’مقدمۂ شعرو شاعری‘‘ کے نام سے جانا گیا اور جس کو اردو تنقید کی پہلی کتاب بھی تسلیم کیا گیا۔

مولانا حالیؔ نے فارسی کے مشہور ادیب اور شاعر شیخ سعدیؔ کی سوانح حیات ’حیاتِ سعدیؔ‘ کے نام سے لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھی بعد میں انھوں نے اپنے فاضل استاد مرزا غالبؔ کی سوانح ’یادگارِ غالبؔ‘ اور سرسید کی سوانح ’حیاتِ جاوید‘ لکھیں جو اردو سوانح نگاری میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ حالیؔ کی دیگر تصنیفات میں سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن (استادِ حالیؔ) مضامینِ حالیؔ ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۱ء وغیرہ ہیں اس کے علاوہ ان کی نظموں میں ’چُپ کی داد‘، ’مناجاتِ بیوہ‘، ’شکوۂ ہند‘ اور دیگر چھوٹی بڑی نظموں کے علاوہ قطعات، رُباعیات، مثنویاں اور قصائد وغیرہ بھی لکھے ہیں، ان کے قصائد تکلف اور بے جا مبالغہ سے پاک ہیں۔ مولانا حالیؔ نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

مولانا حالیؔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں نے نظم ونثر دونوں میدانوں میں اپنی مہارت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے ان کا ایک دیوان یادگار ہے ان کی غزلوں

میں قدیم اور جدید دونوں طرح کے خیالات کی آمیزش ہے۔ان کی غزلوں میں دل سوزی اور جذبات کی گرمی کے ساتھ حق پرستی پند ونصیحت اور مشاہداتِ زندگی کے عناصر موجود ہیں وہ بات کو بڑی سادگی سے کہنے کے قائل ہیں۔

نظم نگار کی حیثیت سے مولانا حالؔی ایک کامیاب شاعر ہیں وہ مقصدی شاعری کے پیش رو ہیں ان کی نظموں میں 'چُپ کی داد'، 'مناجات بیوہ' عورتوں کی حالت زار پر کہی گئی نظمیں ہیں جو سوز و گداز سے لبریز ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں کو ہر فارم میں آزمایا ہے حالؔی کی شاعری خیالات کی بلندی، تشبیہات، استعارات، تصنّع، رعایتِ لفظی وغیرہ سے پاک ہے، وہ شاعرانہ استدلال کو مقصدیت پر قربان کر دیتے ہیں اسی لیے ان کے کلام میں شاعرانہ جوش کم ہی نظر آتا ہے۔

نصاب میں شامل ''مرثیۂ غالبؔ'' مولانا حالؔی کا بہترین کارنامہ ہے مرزا غالبؔ جو حالؔی کے استاد اور بہت اچھے رفیق تھے اور مولانا حالؔی جن کی شخصیت اور شاعری کے پرستار تھے ۱۸۶۹ء میں جب غالبؔ کی وفات ہوئی تو انھیں ان کی موت پر گہرا صدمہ ہوا اور انھوں نے اپنے رنج وغم کا اظہار مرثیۂ غالبؔ کی شکل میں کیا۔حالؔی نے اِس مرثیہ میں اپنے استاد سے والہانہ محبت کا اظہار بڑے جوش وعقیدت کے ساتھ کیا ہے غالبؔ کی موت پر کہا گیا یہ مرثیہ ان کے قلبی واردات کی ترجمانی کرتا ہے حقیقت نگاری، اثر انگیزی کے لحاظ سے یہ اردو کے چند نمائندہ اور منتخب شخصی مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

مرثیۂ غالبؔ

(۱)

کیا کہوں حال دردِ پنہانی　　وقت کوتاہ قصّہ طولانی
عیشِ دنیا سے دل ہوگیا سرد　　دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال　　گوشۂ فقر و بزم سلطان
بحرِ ہستی بجز سراب نہیں　　چشمۂ زندگی میں آب نہیں

(۲)

بلبل ہند مرگیا ہیہات　　جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں ، نکتہ سنج ، نکتہ شناس　　پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول　　سوتکلّف اور اس کی سیدھی بات
تھیں تو دلّی میں اس کی باتیں تھیں　　لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مرگئی دلّی!!　　خواجہ نوشاہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم　　یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا　　شہر میں ایک چراغ تھا ، نہ رہا

(۳)

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں　　کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل　　کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب　　کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں　　اہلِ میّت جنازہ ٹھہرائیں !!

(۴)

نثر، حسن و جمال کی صورت　　نظم، غنجِ زلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر　　تعزیت اک ملال کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے　　انوریؔ و کمالؔ کی صورت
دیکھ لو آج، پھر نہ دیکھو گے　　غالبؔ بے مثال کی صورت

(۵)

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج　　اپنا بیگانہ اشک بار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا　　دوشِ احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی　　اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دلِ مضطر کو ، کون دے تسکیں　　ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر　　ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج
غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد　　کس سے خالی ہوا جہاں آباد

(۶)

کیا ہے جس میں وہ مردِ کار نہ تھا　　اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہو　　جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی　　سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے　　جا کے دِلّی سے آئے گا اب کون
مرگیا قدر دانِ فہم و سخن　　شعر ہم کو سنائے گا اب کون
تھا بساطِ سخن یہ اِک شاطر　　ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں نا تمام ہے حآلی　　غزل اس کی بنائے گا اب کون

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

لفظ	معانی
دردِ پنہاں	پوشیدہ درد، چھپا ہوا درد
عالمِ فانی	فنا ہونے والی دنیا
طلسم خواب وخیال	جادو کا تماشا
بزمِ سلطانی	شاہی محفل
بجز	سوائے ،بغیر
بلبلِ ہند	ہندوستان کا بلبل،مراد شاعر (غالبؔ)
نکتہ داں	بات کی باریکی کو سمجھنے والا
نکتہ شناس	ذہین،دانا
ٹھٹھول	ظریف،خوش طبع
روشن دماغ	عالی فہم، ذہین
اصلاح	تصحیح، درستی،نظرِ ثانی
اہلِ میّت	جنازے کے ساتھ جانے والے
تہنیت	مبارک بادی
دل سرد ہونا	دل اداس ہونا
گوشۂ فقر	درویش کا کونہ
بحرِ ہستی	سمندر (مراد دُنیا)

سراب	دھوکہ فریب
ہیہات	افسوس
نکتہ سنج	نچی تلی بات کہنے والا، سخن شناس
سوغات	تحفہ دادِ سخن وری شاعری پر داد پانا شاعری کی پرکھ
غنچِ زُلال	پاکیزہ غنچہ (کلی)
نشاط	خوشی، مسرّت
انوریؔ وکمالؔ	دونوں فارسی کی بلند پایہ شاعر ہیں
نیشتر	نوک دار اوزار، تیر
مضطر	بے چین
مردِکار	وہ شخص جو ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے
انکساری	عجز، عاجزی
بساط	پھیلاؤ چادر، شطرنج
شاطر	شطرنج کا ماہر
چشمِ دوراں	زمانے کی آنکھ
سوگوار	غمگین، رنجیدہ
فگار	زخمی مجروح
ناشاد	ناخوش
سازگار	موافق، لائق
سربلند	شان وشوکت والے لوگ (یہاں مراد مغرور)

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ حالؔی نے عربی کی تعلیم کس سے حاصل کی تھی؟

۲۔ حالؔی کے والد کا کیا نام تھا؟

۳۔ حالؔی نے کس سن میں وفات پائی؟

مختصر سوالات:

۴۔ حالؔی کی دو مشہور نظموں کے نام لکھیے۔

۵۔ حالؔی نے کس کا مرثیہ لکھا ہے؟ اور ان کا حالؔی سے کیا رشتہ تھا؟

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

درِ پنہاں۔ نکتہ داں۔ تہنیت۔ سوغات

تفصیلی سوالات:

۷۔ مولانا حالؔی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۸۔ 'مرثیۂ غالبؔ' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

نظم: ایک تعارف

یوں تو ہر کلام موزوں نظم کے دائرے میں آتا ہے۔لیکن نظم بہ حیثیت صنف اپنی الگ اور انفرادی پہچان رکھتی ہے۔نظم کے معنی ''موتی پرونے'' یا ''لڑی میں پرونا'' بتائے جاتے ہیں۔نظم کا اپنے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔جس طرح ایک ایک موتی پروکر مالا بنائی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح شاعر اپنے خیالات کی ایک ایک کڑی کو الگ الگ مصرعوں کے ربط و تسلسل کے ساتھ موزوں کرتا ہے تب نظم تخلیق پا کر وجود میں آتی ہے۔اس بابت پروفیسر سیّد احتشام حسین کا یہ بیان بھی قابل لحاظ ہے کہ ''جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اُس سے مراد اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مرکزی خیال اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس پیدا ہو سکے۔اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں اور نہ اس کی ہیئت ہی معیّن ہے۔''

غزل کی طرح نظم کے موضوعات میں بھی بلا کی وسعت ہوتی ہے۔زندگی اور کائنات کا ایسا کوئی پہلو نہیں جو نظم کے زمرۂ کار میں نہ آتا ہو۔غزل کے بعد نظم ہی ایسی صنف سخن ہے جو معروف و مقبول ہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ نے نظم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''نظم کی مثال ایک ایسے دریا کی سی ہے، جس میں طرح طرح کے نشیب و فراز ہیں، کہیں وہ چٹّانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک تسلسل اور ایک وحدت ہوتی ہے۔''

ہئیّت کے لحاظ سے نظم کی مندرجہ ذیل اقسام کا چلن اردو میں چلا آ رہا ہے:

۱۔ پابند نظم :

وہ نظم جس میں کسی خاص بحر اور قافیوں کی پابندی ضروری ہو، اُسے پابند نظم کہتے ہیں۔ اس قسم کی نظم میں غزل کی طرح برابر کے مصرعوں کا التزام ضروری ہوتا ہے۔

۲۔ نظمِ مُعرّیٰ :

نظم مُعرّیٰ کا دوسرا نام نظم عاری بھی ہے۔ نظم کی یہ قسم انگریزی ادب کی ''بلینک ورس'' سے مشتق ہے۔ جس میں قافیہ کی پابندی تو نہیں ہوتی لیکن ہر مصرعہ برابر اور مساوی الوزن ہونا لازمی ہوتا ہے۔

۳۔ آزاد نظم :

نظم کی یہ قسم بھی انگریزی کی ''فری ورس'' سے مشتق ہے۔ اس میں ردیف اور قافیے کی پابندی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ اور متعلقہ بحر کے ارکان بھی گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

۴۔ نثری نظم :

آزاد نظم کی طرح نثری نظم بھی چھوٹی بڑی نثری سطور پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں ردیف' قافیے' بحر اور وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔ بعض حضرات نے نثری نظم کو ''نثم'' کا نام بھی دیا ہے جسے ادبی حلقوں میں قبول نہیں کیا گیا۔

نظم نگاری کی ابتداء یوں تو محمد قلی قطب شاہ معانیؔ اور دکن کے بعض دوسرے شاعروں کی بہار یہ نظموں سے ہوئی۔ لیکن نظیرؔ اکبر آبادی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نظم نگاری کو رواج بخشا۔ ان کی عوامی موضوعات پر لکھی منظومات نے نظم نگاری کی روایت کو مضبوط کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو نظم نگاری کا ارتقاء تیزی سے ہونے لگا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزادؔ

نے ''بزم مناظمہ'' کی بنیاد ڈالی تو اردو نظم کو آگے بڑھنے کے خاطر خواہ مواقع فراہم ہوئے۔ حالیؔ نے مُقدّ مہ شعر و شاعری'' کے توسّط سے شعرائے اردو سے جدید طرز کی نظمیں لکھنے کا مطالبہ کیا جس پر کئی شاعروں نے لبیک کہا۔ شبلیؔ نعمانی، علاّ مہ اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی، سرورؔ جہان آبادی، نظم طباطبائیؔ، مولانا اسماعیلؔ میرٹھی، جوشؔ ملیح آبادی اور چکبستؔ لکھنوی جیسے شعراء نے میدان نظم گوئی میں قابل قدر اضافے کیے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں نے تو صنف غزل پر نظم گوئی کو ترجیح دیتے ہوئے خوب سے خوب تر نظمیں تخلیق کیں۔ اس ذیل میں ن۔م۔راشدؔ، میرا جیؔ، احسانؔ دانش، اخترؔ شیرانی، مجازؔ لکھنوی، مخدومؔ محی الدین، مجروحؔ سلطان پوری، وامقؔ جونپوری، فیض احمد فیضؔ، ساحرؔ لدھیانوی، معین احسن جذبیؔ، علی سردارؔ جعفری، سکندر علی وجدؔ، غلام ربانی تاباںؔ اور احمد ندیمؔ قاسمی وغیرہ نے صنف نظم کو بامِ عروج پر پہنچانے کی حتّی الامکان کوشش کی۔

عہد حاضر میں جن شعرائے کرام نے نظم نگاری کے ذریعہ اپنی فکر رسا کے گھوڑے دوڑائے ان میں نداؔ فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، عمیقؔ حنفی، بیکلؔ اتساہی، پروفیسر شہریارؔ، پروفیسر عتیق اللہ اور زبیرؔ رضوی وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ نظم نگاری کا کارواں ہنوز رواں دواں ہے جو اس صنف کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔

نظیرؔ اکبرآبادی

شیخ ولی محمد نام،نظیرؔ تخلص۔۱۷۴۰ء کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے۔نظیرؔ کے والد کا نام شیخ محمد فاروق تھا جن کا انتقال نظیرؔ کی کم عمری میں ہو گیا تھا۔چونکہ نظیرؔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیےان کی تعلیم وتربیت بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔یوں تو نظیرؔ اردو،فارسی اور عربی زبانیں جانتے تھےلیکن پنجابی،مارواڑی،ہندی اور پوربی زبانیں بھی سمجھ لیتے تھے۔جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا تو نظیرؔ اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ چلے آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔آگرہ سے اپنی نسبت پر نظیرؔ ہمیشہ فخر کرتے رہے۔نظیرؔ نے درس وتدریس کو ترجیح دیتے ہوئے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔انھیں خوش نویسی میں بھی دل چسپی تھی اس لیے انھیں’’ہفت قلم‘‘ کے نام سے شہرت ملی۔دیگر علوم وفنون مثلاً طب،نجوم، منطق،معانی بیانی اور موسیقی سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔اس کے علاوہ ورزش اور سپہ گری میں بھی دخل رکھتے تھے،غرض یہ کہ نظیرؔ کثیر المعلومات اور ہمہ داں شخص تھے۔

نظیرؔ کے مزاج میں انکساری،خوش اخلاقی،انسان دوستی،شوخی وظرافت،رنگینی وبذلہ سنجی اور وسیع المشربی جیسے اعلیٰ اوصاف موجود تھے۔نظیرؔ کی زندگی عُسرت اور غریبی میں بسر ہوئی۔نوّے برس کی عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہونے کے سبب وہ چار پانچ برس تک بیمار رہے اور بالآخر ۱۶/اگست ۱۸۳۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نظیرؔ اردو شاعری میں’’عوامی شاعر‘‘ کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔انھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جن کی طرف ان سے قبل کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔بعض اہل علم نے ان کے اس قدم کو جائز نہیں مانتے ہوئے ان کے کلام کو سوقیانہ قرار دے کر اس کی اہمیت سے انکار کیا

ہے۔لیکن سچائی یہ ہے کہ نظیؔر وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کا رشتہ انسانی زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔انھوں نے ’’ آدمی نامہ‘‘، ’’ہولی نامہ‘‘،’’ بنجارہ نامہ‘‘، ’’دیوالی‘‘، ’’ شب برأت‘‘، ’’مفلسی‘‘، بالپن بانسری بجیا‘‘، ’’کلجگ‘‘ ، ’’ روٹیاں‘‘اور’’ خوشامد‘‘ جیسی نظمیں تخلیق کر کے اپنے قومی فریضے کوانجام دیا۔

نظم ’روضۂ تاج گنج ‘، نظیؔر کی تہذیبی وثقافتی نظموں میں شمار ہوتی ہے اس نظم میں انھوں نے محبت کی یادگار اور دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہونے والے’’ تاج محل‘‘ کے متعلق اپنے جذبات واحساسات کا مظاہرہ کیا ہے۔نظیؔر کا یہ نظریہ ہے کہ یہ خوبصورت عمارت دھن ودولت کے بجائے ایثارومحبت کے جذبہ پر قائم ہے۔اس عمارت میں لگے پتھروں کے دل بھی محبت کی حرارت سے دھڑکتے ہیں۔قابل تعریف ہیں وہ معمار جنھوں نے اسے بنانے میں جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ یہاں کے باغ اور دالان دلوں کا دامن کھینچتے ہیں۔جو نقش ونگار مصوّروں نے قلم سے بنائے ہیں انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے گویا وہ مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔یہاں بادِ نسیم ایسے چلتی ہے جیسے یہ گلشنِ فردوس کی کھڑکی سے آرہی ہو۔بادشاہ شاہجہاں کا یہ شاہکار ہمیشہ ہندوستان کے لیے باعثِ افتخار تسلیم کیا جائے گا۔

نظیرؔ اکبرآبادی

روضۂ تاج گنج

یارو! جو تاج گنج یہاں آشکار ہے		مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے		روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
نقشے میں اپنے یہ بھی عجب خوش نگار ہے

روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں یہاں		پر اس مکاں کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
سنگِ سفید سے جو بنا ہے قمر نشاں		ایسا چمک رہا ہے تجلّی سے یہ مکاں
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے

گنبد میں اس کا زور بلندی سے بہرہ مند		گرد اس کے گنبدیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
اور وہ کلس جو ہے سرِ گنبد سے سر بلند		ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
ہر ماہ جس کے خم پہ مہِ نو نثار ہے

ہیں بیچ میں مکاں کے وہ دو مرقدیں جو یاں		گِرد اُن کے جالی اور مُجّر ہے درفشاں
سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں		پتے، کلی، سہاگ رگ رنگ ہے عیاں
جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے

دیواروں پر جو سنگ ہے نازک عجب نگار		آئینے بھی لگے ہیں مجلّی و تاب دار
دروازے پر لکھا ہے خطِ طغرا طرفہ کار		ہر گوشے پر کھڑے ہیں جو مینار اس کے چار
چاروں طرف سے اوج کی خوبی دو چار ہے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دل کشا　　آتی ہے جس میں گلشنِ فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا　　ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھومتا
فوّارے چھٹ رہے ہیں رواں جوئے بار ہے

وہ تاجدار شاہجہاں صاحبِ سریر　　بنوایا ہے انھوں نے لگا سیم و زر کثیر
جو دیکھتا ہے اُس کے یہ ہوتا ہے دل پذیر　　تعریف اس مکان کی میں کیا کروں نظیرؔ
اس کی صفت تو مشتہرِ روزگار ہے

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
ترجیح دینا	فضلیت دینا، بہتر سمجھنا، فوقیت دینا
معلّمی	بچوں کو پڑھانے کا پیشہ، مدرسی
بذلہ سنجی	ہنسی مذاق، خوش طبعی
وسیع المشر بی	دور تک پھیلا ہوا، کشادہ، فراخ
سوقیانہ	بازاری، عوام کی پسند کا، مبتذل
درویش صفت	وہ شخص جس میں بزرگوں، فقیروں اور خدارسید لوگوں جیسی خوبیاں ہوں
تہذیب	خوش اخلاق، شائستگی، صفائی
ثقافت	تہذیب، کلچر، نیک ہونے کی دلیل
مصنوعی	بناوٹی، نقلی، جعلی، جو قدرتی نہ ہو
باعثِ افتخار	جس پر فخر و ناز کیا جائے
روضہ	وہ مقبرہ جس پر گنبد بنا ہو
آشکار	ظاہر، نمایاں، کھلا ہوا، واضح
شہر و دیار	ملک، علاقہ، نگر، بڑی آبادی
اعتبار	تکیہ، بھروسہ، اعتماد، یقین

کنار	بغل، آغوش، گود، سینہ
خوش نگار	اچھا لگنے والا، خوش رقم بہترین کاتب
روئے زمین	زمین کی سطح
سنگِ سفید	سفید پتھر، سنگ مرمر
قمر نشاں	چاند کی طرح حسین وخوبصورت
تجلی	تابانی، روشنی، چمک
بلور	ایک چمکدار اور شفاف معدنی جوہر
گنبد	برج، گول چھت، عمارت کا بالائی حصہ جو گول ہوتا ہے
بہرہ مند	صاحبِ قسمت، خوش نصیب
کلس	گنبد کے اوپر کا نوک دار حصہ جو چمکیلا ہوتا ہے
سربلند	معزز، عالی مرتبہ، ممتاز، سرفراز
ہلال	مہینے کا پہلا چاند
ماہ	مہینہ
مہِ نو	ہلال، مہینے کا پہلا چاند
نثار	صدقے، قربان، نچھاور
مرقدیں	آرام گاہیں، قبریں، مزارات
گِرد	آس پاس، قریب، اِرد گِرد
مُجرّ	جالی دار
دُرفشاں	چمک دار، تابناک، خوش نما

سنگینِ گل	بھاری پتھر پر کشیدہ کاری کرنا
تہہ نشاں	وہ سونے اور جواہرات کا کام جو تلوار کے قبضے پر ہوتا ہے
سہاگ	ایک قسم کا عطر یا خوشبو
رگِ رنگ	جسم کی وہ نلیاں جن میں خون رہتا ہے
عیاں	ظاہر، نمودار، کھُلا ہوا
نقش	صورت، شبیہ، مورت، تصویر
جواہر نگار	مرصّع، جڑاؤ، خوشخط، خوبصورت لکھنے والا
عجب نگار	جس کی تحریر سب سے جدا اور منفرد ہو
مجلّی وتابدار	تاباں، روشن، چمک دار، تجلی نما
خطِ طغرا	عربی رسم الخط میں پیچیدہ مگر فن کارانہ اور خوبصورت تحریر
طُرفہ کار	نادر اور انوکھا کام کرنے والا
گوشے	کونہ، خلوت، تنہائی
اوج	اونچائی، بلندی، رفعت، عروج
صحن	آنگن، انگنائی
دل کشاں	دل کو خوش کرنے والا، دل شگفتہ کرنے والا
گلشنِ فردوس	جنت کا باغ، جنت کی پھلواری
ہرسو	ہر طرف، ہر جگہ
نسیم	صبح کی ٹھنڈی ہوا
جوئے بار	ایک ایسی بڑی نہر جس میں بہت سی نہریں آ کر مل جاتی ہیں

نہروں کا خطہ

تاجدار	بادشاہ، صاحبِ تاج، تاج والا
صاحب سریر	تخت شاہی یا گدّی و مسند کا مالک
سیم و زر	چاندی اور سونا
کثیر	بہت، زیادہ، بے شمار، افراط سے
دل پذیر	مرغوب، پسندیدہ
صفت	وصف، خوبی، خاصیت
مشتہر	مشہور کیا گیا، شہرت دیا گیا
روزگار	زمانہ، گزارا، قسمت، موقع محل

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ 'روضہ' کسے کہتے ہیں؟

۲۔ 'جوئے بار' کسے کہتے ہیں؟

۳۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم 'روضۂ تاج گنج' کے علاوہ دو نظموں کے عنوانات لکھیے۔

مختصر سوالات:

۴۔ مندرجہ ذیل کے متضاد الفاظ لکھیے۔

قمر۔ مصنوعی۔ مہ۔ اوج۔

۵۔ لفظ 'فردوس' کے مترادف الفاظ لکھیے۔

۶۔ 'روضۂ تاج گنج' کہاں ہے اور کس پتھر سے بنا ہوا ہے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ نظم 'روضۂ تاج گنج' کا خلاصہ لکھیے۔

۸۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعرانہ خصوصیات تحریر کیجیے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین نام، حالؔی تخلص۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ حالؔی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش انصاری تھا۔ جب حالؔی محض نو برس کے تھے تب ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، لہٰذا حالی کے بڑے بھائی امداد حسین اور بہن نے ان کی پرورش اور تعلیم کی ذمے داری اٹھائی۔ حالؔی بلا کے ذہین اور محنتی تھے۔ بچپن میں ہی قرآنِ مجید حفظ کرنے کے بعد انھوں نے پانی پت میں ہی تھوڑی سی فارسی سید جعفر علی سے اور عربی حاجی ابراہیم حسین سے پڑھی۔ سترہ برس کی عمر میں ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی گئی، اس لیے پوشیدہ طور پر وہ دہلی چلے آئے، اور مولوی نوازش علی سے عربی کی تعلیم مکمل کی اور منطق کے ساتھ علم عروض بھی سیکھا۔ اسی زمانے میں حالؔی کی مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور نواب غلام مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے شناسائی ہوئی۔ تقریباً آٹھ برس تک حالؔی، شیفتہؔ کے بچوں کے معلم رہے۔ شیفتہؔ کی صحبتوں نے ان کے ذوقِ شعر گوئی اور ملکۂ شعر فہمی کو چمکا دیا لیکن حالؔی نے مرزا غالبؔ کی شاگردی قبول کی۔

۱۸۵۷ء میں حالؔی نے اپنے وطن پانی پت لوٹ کر ملازمتی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر آپ ۱۸۷۲ء میں گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کرنے لگے، یہاں آپ نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی عبارت درست کرنے کا کام کیا۔ لاہور میں حالؔی نے مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر 'انجمن پنجاب' کے مشاعروں میں جدید اردو نظم کے بنیاد گزار کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۸۷۴ء میں حالؔی لاہور سے دہلی چلے آئے اور اینگلو عربک کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں دنوں انھوں نے سرسید احمد خاں کی فرمائش پر 'مسدس مدّ و جزر اسلام' تخلیق کر کے میدانِ شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ سر

سید کی سفارش پر جب حالؔی کو سرکاری وظیفہ ملنے لگا تو انھوں نے ملازمت سے کنارہ کشی کرتے ہوئے علمی و ادبی امور میں آزادانہ طور پر دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۹۱۴ء میں حالؔی کو ''شمس العلما'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو بمقام دہلی ستّر برس کی عمر میں حالؔی کا انتقال ہوا۔

حالؔی نے نثر و نظم میں یکساں طور پر ادبی خدمات انجام دیں۔ نثر میں 'حیات سعدؔی' (۱۸۸۶ء)، 'حیاتِ جاوید' (۱۸۹۴ء) اور 'یادگارِ غالبؔ' (۱۹۰۱ء) اُن کی بہترین سوانح عمریاں ہیں۔ اس کے علاوہ 'مقدمہ شعر و شاعری' اور 'مقالاتِ حالؔی' بھی قابلِ تحسین نثری کارناموں میں شامل ہیں۔

حالؔی نے بہ حیثیت شاعر بھی کامیابی حاصل کی۔ یوں تو انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، ترجیع بند، ترکیب بند اور قطعہ گوئی میں طبع آزمائی کی لیکن اپنی شاہ کار شعری تخلیق 'مسدس مد و جزر اسلام' (۱۸۹۳ء) کے ذریعہ انھیں دائمی شہرت ملی۔ جدید نظم گو کی حیثیت سے حالؔی کا مقام مسلّم ہے۔ انھوں نے جدید مضامین و موضوعات اور منفرد اسلوب بیان سے اردو کا دائرہ وسیع کیا۔ مبالغہ آرائی اور تصنّع سے ان کا کلام پاک صاف ہے۔ بیان کی ندرت اور زبان کی سلاست ان کا طُرّہ امتیاز ہے۔ حالؔی کی مشہور اور کامیاب نظموں میں 'برکھا رت'، 'چپ کی داد'، 'مناجاتِ بیوہ'، 'نشاطِ امید'، 'ظہورِ رحمت'، 'خود ستائی' اور 'تعصب اور انصاف' وغیرہ شامل ہیں۔

نظم 'جدید ترقیات' بھی حالؔی کی مذکورہ منظومات کی طرح نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم کے توسط سے حالؔی نے یہ پیغام دیا ہے کہ یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے لہٰذا اس دور میں وہی کامیاب و کامران ہوسکتا ہے جو سائنسی علوم و فنون سے واقف ہو۔ اس لیے ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ سائنسی علوم و فنون میں مہارت حاصل کریں تا کہ ہماری قوم کا شمار بھی ترقی یافتہ اقوام میں ہوسکے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

جدید ترقیات

اے عزیزو! میں بھی ہوں آخر بنی نوعِ بشر
غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر
کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جو ہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں
طائرِ وہم و تصوّر کے جہاں جلتے ہیں پر
اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر کیا
ابرو برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در
حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحرو بر
تھا ارسطو اور افلا طون کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہوگئے تقویم پارینہ وہ سب علم و ہنر
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دم بدم یوں آج کل علمِ بشر
قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

سازوساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کے نصیب
کوڑیوں کے مول سے پھرتے ہیں وہ در بدر
کہتے ہیں مغرب سے ہوگا جب برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آرہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
منطق	علم دلیل،علمِ مناظرہ،ٹھیک طور سے سوچنے کا علم
علمِ عروض	وہ علم جس سے نظم کے قواعد معلوم ہوتے ہیں
مُسَلَّم	درست،،بجا،ٹھیک،تسلیم کیا گیا،مانا گیا
طُرّۂ امتیاز	خوبی،عمدگی،انوکھی بات
توسط	ذریعہ،وسیلہ
جدید	نئی،نیا،تازہ،اب کا
ترقیات	ترقی کا جمع بمعنی آگے بڑھنا،اونچا ہونا،بلندی،برتری
بنی نوع	بشر،انسان،انسان کی اولاد
بشر	آدمی،انسان،منش
غل	شور،ہنگامہ
جوہر	خوبی،خاصیت،لیاقت،استعداد
آشکار	ظاہر،نمایاں،کھلا ہوا،واضح
شانِ کبریائی	اللہ کی عظمت،شوکت،دبدبہ،توقیر
جلوہ گر	خاص بناؤ سنگھار یا سج دھج کے ساتھ نمودار ہونا
رفتہ رفتہ	آہستہ آہستہ،ہولے ہولے،بتدریج

غبارِ ناتواں	معمولی گرد اور مٹی کے مانند
طائرِ وہم وتصوّر	تصور وخیال کا پرندہ
مسخر	تسخیر کیا گیا، بالغ کیا گیا، قبضہ کیا گیا، فتح کیا گیا
ابر	بادل، گھٹا، بدلی
برق	بجلی، صاعقہ
باد	ہوا، باؤ، پوَن
تا	تک، تا کہ، جب تک
بحروبر	تری اور خشکی، تمام دنیا، سمندر اور زمین
دشت ودر	جنگل، صحرا، بیابان، شطرنج کا تختہ
حق	سچ، صدق، لائق، واجب، اللہ تعالیٰ
خلافت	نیابت، اللہ والے کی جانشینی، خلیفہ کا عہدہ
ارسطو	یونان کا مشہور عالم جو فلسفے کا معلم اوّل کہلاتا ہے۔ وہ سکندر کا استاد اور مشیر تھا
افلاطون	یونان کے ایک بہت بڑے حکیم کا نام جو بقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا
ناز	فخر، غمزہ، عزت، بڑائی
تقویم پارینہ	پرانی جنتری، بے کار چیز، نکمی چیز
علم وہنر	دانش مندی، دانائی، آ گاہی، فنکاری
تحقیقات	تحقیق کی جمع بمعنی دریافت کرنا کھوج لگانا

دم بدم	ہر گھڑی، ہر وقت، برابر، متواتر، پے در پے
علم بشر	وہ علم جو بنی نوع انسان کی دسترس میں ہو
قوت ایجاد	ایجاد کرنے کی طاقت یا قدرت
سحر	صبح، فجر، تڑکا
سازوسامان	اسباب، ضروری چیزیں، آلات، بندوبست
آفتاب	سورج، خورشید، مہر
رَو	دھار، جوش، ولولہ، پانی کا بہاؤ
زیروزبر	تہ و بالا، درہم برہم، الٹ پلٹ، تباہ
دستکاری	ہنر، کاری گری، ہاتھ کا کام
صنعتوں	صنعت کی جمع بمعنی کاری گری، دستکاری
علم وحکمت	دانش مندی، دانائی، ہنر مندی، آگاہی، فنکاری
غافلوں	غفلت کرنے والے، بے پروا، بےخبر لوگ

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ''جدید'' کسے کہتے ہیں؟

۲۔ حالیؔ کس عظیم شاعر کے شاگرد تھے؟

۳۔ حالیؔ کس شاعر کے بچوں کو پڑھاتے تھے؟

مختصر سوالات:

۴۔ لفظ ''ابرو'' کے مترادف الفاظ لکھیے۔

۵۔ حالیؔ کی نثری کتابوں کے نام لکھیے۔

۶۔ حالیؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ ارسطوؔ اور افلاطون کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۸۔ نظم ''جدید ترقیات'' کا خلاصہ لکھیے۔

علاّمہ اقبالؔ

شیخ محمد اقبال نام اور اقبالؔ تخلص ۔ ۹؍نومبر ۱۸۷۷ء کو پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں ولادت پائی۔ اقبالؔ کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام امام بی تھا۔ ان کے بزرگوں کا سلسلہ سپرُو گوت کے کشمیری پنڈتوں سے ملتا ہے۔ جو بعد میں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

اقبالؔ نے ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہو کر مولوی میر حسن شاہ سے حاصل کی تھی۔ ۱۸۹۳ء میں انٹر کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۷ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفے میں ایم اے کیا اس دوران انہیں فلسفے کے مشہور پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

اقبالؔ پہلے اورینٹل کالج لاہور اور اس کے بعد گورنمنٹ لا لج لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے پروفیسر مقرّر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اقبالؔ یورپ گئے۔ آپ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ۔ ڈی۔ اور لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر ۱۹۰۸ء میں ہندوستان لوٹے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ چونکہ وکالت کا پیشہ ان کی طبیعت کے مطابق نہیں تھا اس لیے وکالت ترک کر دی۔ حکومت برطانیہ نے انہیں ۱۹۲۳ء میں ''سر'' کے معزّز خطاب سے نوازا۔ اس کے علاوہ انہیں 'شاعرِ مشرق' اور 'رومیِ عصر' جیسے خطابات سے بھی جانا جاتا ہے۔

اقبالؔ نے تین شادیاں کی تھیں مگر ان کی شادی شدہ زندگی مختلف مسائل میں گزری۔ چونکہ اقبالؔ دل کے مریض تھے اس لیے ان کی صحت مسلسل خراب ہوتی گئی اور آخر کار ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کو بمقام لاہور آپ نے انتقال فرمایا۔

اقبال کی شاعری کا آغاز روایتی انداز کی غزل گوئی سے ہوا تھا۔لیکن جلد ہی ان کی توجہ قومی ووطنی شاعری کی طرف ہوگئی۔اقبالؔ نے مولوی میر حسن شاہ اور داغؔ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ان کی شاعری فکر وعمل، بلند ہمّتی ، یقین کامل، حُبّ الوطنی،قومی یکجہتی اور انسان دوستی کا پیغام دیتی ہے۔

اردو میں اقبالؔ کی شاعری کے چار مجموعے بعنوان ’بانگ درا‘، ’بال جبریل‘ ،’ضربِ کلیم‘ اور ’ارمغان حجاز‘ شائع کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ان کی مشہور نظموں میں ’خِضر راہ‘، ’طلوعِ اسلام‘، ’لینن خدا کے حضور میں‘، ’شکوہ‘، ’جوابِ شکوہ‘، ’فرشتوں کا گیت‘، ’ساقی نامہ‘اور ’مسجد قرطبہ‘وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

نظم ’شُعاعِ اُمید‘اقبالؔ نے اپنے انتقال سے دو برس قبل ۱۹۳۶ء میں تخلیق کی تھی۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے ’ضربِ کلیم‘ کی نمائندہ نظموں میں مخصوص مقام رکھتی ہے۔ یہ نظم تمثیلی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں سورج اور شعاع کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔سورج اپنی شعاعوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ تم اس دنیا سے آسمان میں لوٹ آؤ کیونکہ دنیا کے لوگ بیدار نہیں ہیں۔لیکن ایک شوخ اور چنچل کرن سورج سے یہ کہتی ہے کہ میں تب تک ہندوستان کی تاریک فضا کو نہیں چھوڑوں گی جب تک کہ خواب غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار نہ کردوں۔ یہ نظم ہندوستانیوں کو مایوسی اور نا اُمیدی سے نکال کر حوصلہ مندی اور بیداری کا پیغام دیتی ہے۔

شُعاعِ اُمّید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدّت سے تم آوارہ ہو پنہائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایاّم
نے ریت کے زروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثل صباطوف گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدہَ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستاں و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شُعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّت نظّارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہُوت ہے خاموش

پھر ہم کو اُسی سینہ روشن میں چھپالے
اے مہر جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہومشرق کا ہراک زرّہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِتاب
اس خاک سے اُٹھّے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پرآشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حزر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
شُعاعِ اُمّید	اُمّید کی کرن
آوارہ	بے مقصد بھٹکنے والا
پنہائے فضا	فضا کی وسعت
بے مہری ایّام	زمانے کی ناموافقت، بے توجہی، تقدیر کی گردش
راحت	آرام
مثلِ صبا	مشرقی ہوا کی طرح
طوف	طواف۔آس پاس چکّر لگانا
گوشہ	کونہ
تجلّی کدہ	جلوہ گاہ، روشنی کا جگہ
بیابان	جنگل
در و بام	آبادی (دروازے اور چھت)
آفاق	آسمان۔دنیا
ہم آغوش	ملنا۔ملنے والی
مغرب	مغربی تہذیب پر چلنے والے
افرنگ	یورپ۔انگریز

سیہ پوش	کالا لباس پہننے والے (تاریک)
مشرق	مشرقی تہذیب کے ماننے والے
لذّتِ انتظار	دیدار کی لذّت
عالمِ لاہُوت	فنا فی اللہ کا مقام۔ تصوّف میں وہ درجہ جو سالک کو حاصل ہوتا ہے
مہرِ جہاں تاب	سورج دنیا کو روشن کرنے والا (عالم بالا)
فراموش	نظرانداز
جوہر	اصل فطرت
سیماب	پارہ ایک دھات۔ جو ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتی
رخصتِ تنویر	روشن کرنے کی اجازت
مردانِ گراں خواب	گہری نیند میں سوئے ہوئے لوگ
خاور	مشرق
پروین	ثریّا، جھمکا، وہ سات ستارے جو پاس پاس رہتے ہیں
خذف ریزہ	ٹھیکری کا ٹکڑا
دُرِ تاب	سچّا موتی
غوّاصِ معانی	حقیقت کی تہہ تک پہنچنے والے عالم
غوّاص	غوطہ خور
بحر	سمندر
پرآشُوب	ہنگاموں اور مصیبتوں سے گھرا ہوا
پایاب	تہہ میں بیٹھنے والا

بیگانہ مضراب	مراد خاموش، مضراب جس سے باجا بجایا جاتا ہے
تہہِ محراب	مسجد میں پیش امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کے نیچے
بیزار	ناخوش، بددل
حذر	پرہیز
مزید	اضافہ، بیشی، بڑھوتری
معزّز	عزّت دار، بڑا، باوقعت
خطاب	تعریف کے طور پر اچھّا نام
بیداری	ہوشیاری، عقل، سمجھ، دانائی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

(۱) ''شُعاعِ اُمید'' کے کیا معنی ہیں؟

(۲) لفظ 'مہرِ عالم تاب' کے معنی بتائیے۔

(۳) ''عالمِ لاہوت'' سے اقبالؔ کی کیا مراد ہے؟

مختصر سوالات:

(۴) اقبالؔ کے دو شعری مجموعوں کے عنوانات لکھیے۔

(۵) اقبالؔ کو کن کن القاب سے یاد کیا جاتا ہے؟

(۶) ''شُعاعِ اُمید'' کے علاوہ اقبالؔ کی دو نظموں کے نام لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

(۷) نظم ''شُعاعِ اُمید'' کا خلاصہ لکھیے۔

(۸) اقبالؔ کی سوانح لکھتے ہوئے ان کے کلام کی چند خصوصیات بیان کیجیے۔

برج نرائن چکبست

برج نرائن نام، خاندانی لقب "چکبست"، تخلّص کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں خود فرماتے ہیں:

ذکر کیوں آئے گا بزمِ شعر میں اپنا
میں تخلّص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

اس کے باوجود انھوں نے اپنے خاندانی لقب "چکبست" کو اپنے کلام میں جگہ جگہ تخلّص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چکبست کی ولادت ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد ہوئی۔ آپ کے اہل خاندان کشمیری برہمن تھے۔ آپ کے والد کا نام اُدت نرائن چکبست تھا جو یقیں تخلّص فرماتے تھے۔ چکبست کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے کنگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے وکالت شروع کی۔ اپنی قابلیت وصلاحیت کی وجہ سے آپ لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۲؍فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمے کے سلسلے میں آپ رائے بریلی سے لکھنؤ لوٹ رہے تھے تب ریلوے اسٹیشن پر آپ فالج کا شکار ہو گئے۔ زبان بند ہو گئی اور چند گھنٹوں میں آپ آنجہانی ہو گئے۔

چکبست نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کی ابتداء کی تھی۔ چونکہ آپ نے اساتذہ کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا تاہم آپ کے کلام پر میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور آتشؔ وغیرہ کے کلام کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ چکبست نے اردو نظم نگاری کے دامن کو اپنی وسعتوں سے مالا

مال کیا۔آپ نے قومی یکجہتی، وطن پرستی، ذہنی بیداری اور اصلاحِ معاشرت جیسے موضوعات پر خصوصی توجہ صرف کی۔مناظر قدرت کی عکاّسی میں چکبست کو مہارت حاصل تھی۔زبان نہایت صاف اور انداز بیان دلکش تھا۔آپ کا مجموعۂ کلام ''صبح وطن'' کے عنوان سے شائع ہوا۔علاوہ ازیں ''صبح امّید'' نامی ایک رسالہ نکال کر آپ نے اردو صحافت کی تاریخ میں بھی اپنا نام درج کروایا۔

چکبست کی مشہور نظموں میں 'آوازۂ قوم'، 'سیر دہرہ دون'، 'خاکِ وطن' اور 'گوکھلے کا مرثیہ' اہم ہیں۔

نظم 'راماین کا ایک سین' میں چکبست نے اپنے مذہبی عقائد کی عکاّسی کی ہے۔انھوں نے اس نظم کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ رام چندر جی اپنے ماں باپ کے فرماں بردار بیٹے تھے۔انھوں نے اپنے والد راجا دشرتھ جی کے حکم کی تعمیل میں شاہی ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر 'بن باس' کو پسند کیا۔یہ نظم رام چندر جی کا مثالی کردار (آدرش روپ) پیش کرتی ہے چکبست کے دل گداز انداز نے نظم کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ الفاظ کی چُست بندش اور خیالات کی پاکیزگی نے اس نظم کو متاثّر کن بنا دیا ہے۔

برج نرائن چکبست

رامائن کا ایک سین

(انتخاب)

(رام چندر جی اپنی ماں سے اجازت طلب کرنے جا رہے ہیں)

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام | راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام | دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نو نہال | خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال | سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گُم تھی وہ بے گناہ | نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جُنبش ہوئی لبوں کو، بھری ایک سرد آہ | لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر مُوئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں | میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں

سب کو خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں　　　لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بَن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جو گی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم　　　ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت وحشم　　　تم میرے لال تھے، مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اِس تخت وتاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

کِن کِن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ وسال　　　دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال　　　آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ درد خیز　　　اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغِ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور　　　مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور　　　لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اِسی میں ہو پروردگار کی

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب جس سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہُوئیں خراب
سوزِ دُروں سے قلب و جگر ہوگئے کباب پیری مٹی کسی کی کسی کا لٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار یہ جانتے نہیں وہ ہیں دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے، امرِ رضا میں جوخَم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرتے میں چودہ برس تمام قائم امید ہی سے ہے، دُنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اپنی نگاہ ہے کرمِ کار ساز پر صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہر باں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت، دامنِ مادر سے کم نہیں

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

الفاظ	معانی
صلاحیت	بہتری، لیاقت، سمجھ
آنجہانی	جو مر کر دوسری دنیا میں چلا جائے
وُسعت	کُشادگی، چوڑائی، پھیلاؤ، گُنجائش
عقائد	عقیدہ کی جمع بمعنی یقین، ایمان، اعتبار
دل گداز	دل کو نرم کرنے والا
رُخصت	اجازت، منظوری، وداع، روانگی، کُوچ
راہِ وفا	وفاداری کا راستہ
تمام	کُل، سب، مکمّل، خاتمہ
زیارت	دیدار، کسی مقدّس مقام کا نظارہ
اہتمام	انتظام، بندوبست، سرانجام کرنا
کلام	سخن، بات چیت، گفتگو
اظہار	ظاہر کرنا یا ہونا، کھولنا، بیان
بے کسی	لاچاری، عاجزی، بے مددگاری
ستم	ظلم، آزار، ایذا، زیادتی
نونہال	کم عمر یا کم سن بچّہ

صورتِ خیال	معاملہ، کیفیت، ظاہری روئداد
خستہ حال	دل شکشتہ، رنجیدہ، ناخوش، غم گین
سکتہ	تحیّر یا تعجّب کی حالت، حیرت خاموشی
شدّتِ ملال	رنج وغم کی سختی یا کثرت
بشر	آدمی، انسان، منش
زرد	پیلا، سنہری
تصویرِ سنگ	پتّھر کی مورت
بے گناہ	بے قصور، بے خطا، بے جرم
نورِ نظر	آنکھوں کی روشنی، کنایتاً بیٹا
دیدۂ حسرت	حسرت بھری نگاہ
جُنبش	حرکت، گردش، ہلنا
سرد آہ	ٹھنڈی سانس بھرنا، افسوس کرنا
گوشہ ہائے چشم	آنکھوں کے کونے
رُخ	چہرہ، صورت
مُوئے تن	جسم کے بال، رونگٹے، رُوان
صحرا	ویرانہ، بیابان، ریگستان
رواں	جاری، بہتا ہوا، تیز
ہرگز	کبھی نہیں
بن	جنگل، صحرا، بیابان، ریگستان

جوگی	ہندو فقیر، پجاری، جو دنیا کو ترک کر دے
راج دُلارا	شہزادہ، راج کمار
بہم	حاصل ہونا، میَسّر آنا، مہیّا ہونا
شوکت و حشم	شان، شکوہ، دبدبہ، مرتبہ، رتبہ
سلطنت	بادشاہی، حکومت، عمل داری
ریاضتوں	سخت محنت و مشقّت
ماہ و سال	سال اور مہینے
جوگ	موقع و محل، نیک ساعت، صحیح وقت
دردخیز	درد پیدا کرنے والا، درد انگیز
خستہ جاں	زخمی، گھایل، بدحال
تیغ تیز	تیز تلوار، تیز شمشیر
اشک ریز	رونا، آنسو برسانا
ضبط	صبر و تحمّل، پی جانا، جذب کرنا
گریز	بھاگنا، پرہیز کرنا، اجتناب کرنا
ناشاد	رنجیدہ، غمگین، بدقسمت، نامراد
مادر	ماں، والدہ
الم	رنج، غم، دکھ
وفوٗر	افراط، بہتات، زیادتی، کثرت
صدمہ	رنج، غم، دکھ، الم

شاق	دشوار، دوبھر، ناگوار
عالمِ پیری	ضعیفی کا دَور، بزرگی کا زمانہ
خزاں	پت جھڑ، فصلِ خریف، بے رونقی
عیاں	ظاہر، نمودار، کھلا ہوا
مصلحت	نیک صلاح، اچھّا مشورہ، مناسب تجویز
انقلاب	تغیّر و تبدّل، گردش، دور، نیرنگِ زمانہ
سوزِ دُروں	قلبی سوز و درد، اندرونی دکھ
قلب و جگر	دل، جان، کلیجہ
رنج و محن	غم، رنج، آزردگی، ناخوشی
کردگار	خالق، خدائے تعالیٰ
دانائے روزگار	وقت، زمانہ یا دور کو جاننے والا (نظم میں خدا سے مراد ہے)
ثابت قدم	مستقل مزاج، ارادے کا مضبوط، عہد کا پکّا
خم	جھکا ہوا، ٹیڑھا
شادکام	بامراد، کامیاب، خوشحال
رنج و بلا	دکھ، درد، غم، تکلیف
مفر	بھاگنا، فرار ہونا
حَضر	ایک جگہ قیام، پڑاؤ، اقامت
دامانِ دشت	جنگل کا دامن یا آنچل، گوشۂ دشت
دامانِ مادر	ماں کا دامن یا آنچل

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ ''رُخصت'' کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

۲۔ رام چندر جی کس کا نام لے کر اپنے والد سے رخصت ہوئے؟

۳۔ ''نورِنظر'' کسے کہتے ہیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ لفظ 'عیاں' اور 'اہتمام' کے مترادف الفاظ لکھیے۔

۵۔ نظم 'رامائن کا ایک سین' کے آخری بند کا مطلب لکھیے۔

۶۔ 'کیا جانے کس خیال میں تھی گم وہ بے گناہ' اس مصرعے کی وضاحت کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ نظم ''رامائن کا ایک سین'' کے ابتدائی دو بندوں کی تشریح کیجیے۔

۸۔ چکبست کی سوانح عمری لکھتے ہوئے ان کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

قابلؔ اجمیری

عبدالرحیم نام، قابلؔ تخلص۔ ۲۷؍اگست ۱۹۳۱ء کو بمقام قصبہ چُر لی، ضلع اجمیر (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ قابلؔ کے والد کا نام عبدالکریم تھا جو اجمیر میں مکانوں کی ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ چونکہ قابل بچپن ہی میں اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے اس لیے ان کی تعلیم، تربیت اور پرورش دادا دادی کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ قابلؔ نے اپنی تعلیم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ، درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی، اجمیر میں حاصل کی۔ قابلؔ اپنے اساتذہ کے محبوب شاگرد تھے۔ حکیم محمد جمیل دہلوی نے قابلؔ کی تعلیم میں دلچسپی دیکھ کر خوب حوصلہ افزائی کی۔ قابلؔ نے قرآن مجید مکمل کرنے کے بعد صرف ونحو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شیخ سعدیؔ کی 'گلستاں' اور 'بوستاں' پڑھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر قابلؔ نے کچھ دنوں عرضی نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

قابلؔ کو ابتدائی عمر سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لیے انھوں نے ابتداً ایک مشہور شاعر صوفی عبدالرحیم ارمانؔ کے حلقۂ تلامذہ میں جگہ بنائی۔ کچھ عرصے بعد قابلؔ نے استادِ سخن مولانا خواجہ عبدالباری معنیؔ اجمیری کی شاگردی قبول کی۔ معنیؔ اجمیری کی نگرانی میں قابلؔ عمدہ شعر کہنے لگے۔ کئی نقادوں نے قابلؔ کو راجستھان کا روایت شکن شاعر قرار دیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد قابلؔ نے بادلِ ناخواستہ حیدرآباد سندھ (پاکستان) کو اپنا مسکن بنایا۔ چونکہ قابلؔ تپِ دق کی مریض تھے اس لیے یہ خاندانی مرض ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ ایک نرس، جنھوں نے قابلؔ کی تیمارداری کی تھی، ان کی اہلیہ بن گئیں اور بیگم نرگس کے نام سے یاد کی جانے لگیں۔ نرگس صاحبہ نے اگرچہ قابلؔ کی خوب دیکھ بھال کی لیکن ۱۳؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو قابلؔ نے حیدرآباد سندھ (پاکستان)

میں انتقال کیا۔

قابلؔ کو ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کا بھی شوق تھا تا ہم انھوں نے مولانا ماہر القادری کے رسالے 'فاران' کی صحافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامیؔ اور مخدوم محمد یوسف کے تعاون سے ایک ہفت روزہ پرچہ 'شاہین' جاری کیا۔ علاوہ ازیں روزنامہ 'جاوید' اور 'آفتاب' سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ قابلؔ کی تخلیقات ان دونوں اخبارات میں متواتر شائع ہوتی تھیں۔

قابلؔ کے سو اشعار کا ایک مختصر ترین مجموعہ بعنوان 'قابلؔ کے سو شعر' جگرؔ مراد آبادی کی تحریر کے ساتھ شائع ہوا۔ قابلؔ کے انتقال کے بعد ان کی بیگم نرگس قابل نے قابلؔ کے دوست محسنؔ بھوپالی کی کوششوں سے قابلؔ کی پہلی برسی کے موقع پر ۱۹۶۳ء میں ان کا مجموعۂ کلام 'دیدۂ بیدار' اپنے ذاتی خرچ سے شائع کرایا۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں ان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'خونِ رگ جاں' منظر عام پر آیا۔ ۱۹۹۲ء میں متحدہ عرب امارات سے 'کلیات قابلؔ' کی اشاعت عمل میں آئی۔ قابلؔ کے صاحب زادے ظفرؔ قابل موقع بہ موقع قابلؔ کا غیر مطبوعہ کلام منظر عام پر لاتے رہتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں انھوں نے قابلؔ کا ایک شعری مجموعہ 'عشق انسان کی ضرورت ہے' شائع کروایا جس میں قابلؔ کی نمائندہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔

قابلؔ کے تلامذہ کی فہرست بہت مختصر ہے جس میں عبد الطیف رندؔ اور عبدالرحمٰن مسرورؔ صدیقی جیسے شاعروں کے نام شامل ہیں۔ قابلؔ نے اگر چہ غزلوں کے مقابلے نظمیں کم کہی ہیں لیکن ان کی نظمیں اپنی مثال آپ ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی مشہور اور کامیاب نظموں میں 'چاندنی رات'، 'امروز'، 'جہانِ نو' اور 'رفیقانِ اجمیر کے نام' کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قابلؔ کو غزل گوئی کی طرح نظم نگاری میں بھی قدرت حاصل تھی۔

بقول پروفیسر ارشد رضا:

''قابلؔ کی شاعری میں زندگی کی تلخیاں اور نفسیات کی باریکیاں ایسی سموئی ہوئی ہیں جس طرح ایک کامل مصور مختلف رنگوں کے مزاج اور خطوط کی کشیدگی سے ایک ایسی تصویر بناتا ہے کہ دیکھنے والے پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔''

قابلؔ کی نظم 'بیادِ اجمیر' مادرِ وطن سے ان کی محبت وعقیدت کی مثال پیش کرتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد قابلؔ کو بادلِ ناخواستہ اجمیر سے ہجرت کرنی پڑی تھی، لیکن وہ تادمِ حیات اجمیر اور اہل اجمیر کو نہیں بھولے۔ خواجہ کا آستانہ، جھالرے کا پانی اور بچپن کا یار جانی یاد آنے پر قابلؔ زار و قطار اشک بار ہوتے تھے۔ یہ نظم نہیں بلکہ قابلؔ کی فریاد ہے۔ اس نظم اور اخترؔ شیرانی کی نظم 'او دیس سے آنے والے بتا' میں بہت مماثلت ہے۔

قابلؔ اجمیری

بیادِ اجمیر

جب ابرِ مست چھایا پیغامِ یار لایا
جب پھول مسکرایا کوئل نے گیت گایا
اجمیر یاد آیا
بلبل نے جب پکارا اک تیر دل پہ مارا
جذبات کو اُبھارا غم کا غبار چھایا
اجمیر یاد آیا
راتوں کی خامشی میں تاروں کی روشنی میں
شفّاف چاندنی میں دل نے سکوں نہ پایا
اجمیر یاد آیا
فکرِ چمن نہ پوچھو یادِ وطن نہ پوچھو
دیوانہ پن نہ پوچھو اکثر فریب کھایا
اجمیر یاد آیا
خواجہ کا آستانہ دربارِ خسروانہ

وہ کیف وہ ترانہ کچھ بھی نہ ساتھ لایا
اجمیر یاد آیا
وہ جھالرے کا پانی آبِ بقا کا ثانی
بچپن کا یار جانی اب ہوگیا پرایا
اجمیر یاد آیا
معنیؔ[1] سا آہ رہبر ہائے نیازؔ[2] و اطہرؔ[3]
اب کیا کہیں کہ دل پر کس کس کا داغ کھایا
اجمیر یاد آیا

[3]، [2]، [1]: شعرائے اجمیر

مشکل الفاظ اوران کے معانی

الفاظ	معانی
روایت شکن	پرانے طور طریقوں یا چلن کو توڑ کر نئی راہ نکالنے والا
ہجرت	وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا
عرضی نویسی	قانونی اجازت سے عرضیاں لکھنے والا
حوصلہ افزائی	ہمت بڑھانا، شاباش دینا
حلقۂ تلامذہ	شاگردوں کی مجلس یا جماعت
صرف ونحو	وہ علم جس میں لفظوں کا جوڑ توڑ اور ان کے بولنے، برتنے کا قاعدہ بیان کیا جاتا ہے
تلخیاں	کڑواہٹ، سختی، تیزی، ترشی
سحر	جادو، طلسم
کیفیت طاری ہونا	حالت، عالم اور رنگ کا چھانا یا غلبہ ہونا
بادلِ ناخواستہ	دل سے نہیں چاہتے ہوئے بھی
تادمِ حیات	تاعمر، زندگی بھر، زندہ رہنے تک
زاروقطار	اشک باری کرنا، بہت رونا
ابرمست	مستی بھرا بادل
پیغام	پیام، سندیسہ، خبر پہنچانا

جذبات	جذبہ کی جمع بمعنی جوش، ولولہ، کشش
غبار	گرد، دھول، خاک، ملال، آزردگی
شفّاف	نہایت صاف، جس میں آر پار نظر آئے
فریب	دغا، مکر، دھوکا، جھانسہ، شعبدہ
آستانہ	بزرگ کا مزار، چوکھٹ، روضۂ مبارک کا دروازہ
خسروانہ	شاہانہ، بادشاہانہ، بادشاہی طریقے والا
کیف	نشہ، خمار، سرور
ترانہ	نغمہ، راگ، گیت
آبِ بقا	آبِ حیات، امرت جل
ثانی	مقابل، مانند، ہم پلہ، ہم سر

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ نظم ''بیادِ اجمیر'' کے شاعر کا نام کیا ہے؟

۲۔ قابلؔ اجمیری نے کس کے دربار کو خسروانہ بتایا ہے؟

۳۔ قابلؔ اجمیری کے مطابق کس کا پانی آبِ بقا کا ثانی ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ نظم ''بیادِ اجمیر'' میں اجمیر کے کن کن شاعروں کے نام آئے ہیں؟

۵۔ ''شفّاف چاندنی'' سے قابلؔ اجمیری کی کیا مراد ہے؟

۶۔ قابلؔ اجمیری کی تاریخِ ولادت و وفات مع مقام تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ نظم ''بیادِ اجمیر'' کا خلاصہ لکھیے۔

۸۔ قابلؔ اجمیری کی سوانح اور خصوصیاتِ کلام پر روشنی ڈالیے۔

سریع مطالعہ

ڈاکٹر فیروز بیگ

اردو زبان کی پیدائش: مختلف نظریات

ہندوستان مشترکہ تہذیبوں اور بولیوں کا گھر ہے۔اس وسیع وعریض ملک میں مختلف رسم ورواج کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج، طورطریق علاقائی سطح پر بدلتے رہتے ہیں اس طرح مختلف علاقوں میں الگ الگ بولیاں بولی جاتی تھیں۔انھیں علاقائی اور باہر سے آئی ہوئی زبانوں کے میل جول سے ایک مخلوط زبان نے جنم لیا جسے ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں اردو سرزمینِ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ یہ زبان سندھ، پنجاب، دہلی، دکن اور آس پاس کی زبانوں کا اثر قبول کرتی ہوئی سارے ہندوستان میں پھیلی، مختلف ادوار میں اس کو مختلف ناموں سے جانا گیا۔ ہندوستان کی نسبت سے اسے ہندی یا ہندوی کہا گیا۔حضرت امیر خسرو نے اسے ہندی اور ہندوی کہا ہے۔اس کے علاوہ اسے اردوئے معلّٰی، زبانِ دہلوی، ریختہ اور ہندوستانی ناموں سے جانا گیا۔

اردو زبان کی ابتدا کے متعلق مختلف محققین نے تاریخی حقائق کی روشنی میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد، مختلف مقامات پر ان کا قیام، وہاں کی زبانوں کے اثرات، اردو زبان کی تشکیل میں ان سب کا بڑا اہم رول رہا۔

سیدسلیمان ندوی کا نظریہ:

سیدسلیمان ندوی اپنی کتاب 'نقوشِ سلیمانی' میں لکھتے ہیں۔مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا، ہیولیٰ اسی وادئ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''

چونکہ مسلمان پہلی بار محمد بن قاسم کی قیادت میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا۔اور راجا داہر کو شکست دے کر سندھ کو مسلم حکومت کا ایک صوبہ بنالیا اور قریب یہاں تین سو سال حکومت کی۔محمد بن قاسم کے لشکر میں عربی بولنے والے لوگ تھے۔ان کی زبان سندھ کی زبان سے متاثر ہوئی اور دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا اور جس کے نتیجے میں مقامی بولی اور عربی کی آمیزش شروع ہوئی اور اس طرح ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔

محمود شیرانی کا نظریہ:

محمود شیرانی نے اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں اس بات پر زور دیا کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے اس کی دلیل میں انھوں نے دونوں زبانوں کے صرف ونحو، تذکیر و تانیث جمع و واحد کے طریقے میں مماثلت کا ہونا بتایا۔

چونکہ محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر حملے کرنے شروع کئے۔دھیرے دھیرے مسلمان سارے پنجاب میں پھیل گئے۔ان لوگوں کی زبان فارسی اور ترکی تھی۔ان لوگوں اور مقامی لوگوں کے آپسی میل جول سے یہ زبان وجود میں آئی۔محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ'' اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔''

محمد حسین آزاد کا نظریہ:

اردو زبان کی ابتدا سے متعلق محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ''آب حیات'' میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور

برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔'' اس نظریہ کو علمی حلقوں نے اس زمانے میں قبول کیا اور برج بھاشا کو عام طور پر اردو کی ماں سمجھا جانے لگا۔ اس نظریہ کو محمد حسین آزاد سے پہلے میر امن، سرسید احمد خاں اور امام بخش صہبائی بھی پیش کر چکے تھے۔ چونکہ برج بھاشا دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور وہاں اس زبان کو خاص مرتبہ حاصل تھا اس لیے آزاد نے اردو اور برج کے رشتے پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ:

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ''داستانِ زبانِ اردو'' میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اور پروفیسر گیان چند جین بھی کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے، کھڑی بولی دہلی اور مغربی یوپی کی بولی ہے۔''

پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ:

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف ''مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'' میں دہلی اور اس کے پاس بولی جانے والی بولیوں کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے نزدیک ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں ان کے مطابق ''نواحِ دہلی کی یہ بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں۔''

غرض اردو زبان کی ابتدا کے مختلف نظریات کے پیشِ نظر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ عربی، فارسی، ترکی زبان بولتے ہوئے آئے اور سندھ میں قریب تین سو سال سکونت اختیار کی تو وہاں کی زبان کے اثرات قبول کیے پھر پنجاب میں محمود غزنوی کی قیادت میں دو سو سال قیام کیا تو پنجابی زبان کے قریب ہو گئے جب دلی پایۂ تخت بنا تو کھڑی بولی، برج بھاشا، ہریانی

اور میواتی زبانوں کا اثر قبول کیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اردو نے نہ صرف عربی و فارسی بلکہ سنسکرت،انگریزی اور سینکڑوں مقامی زبانوں کے الفاظ قبول کیے ہیں۔اس طرح اردو زبان نے موجودہ شکل اختیار کی۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۲۔ اردو کس زبان کا لفظ ہے؟

۲۔ ''پنجاب میں اردو'' کے مصنف کا نام تحریر کیجیے۔

۳۔ مسلمان پہلی بار کس کی قیادت میں سندھ میں داخل ہوئے؟

مختصر سوالات:

۴۔ اردو زبان کی پیدائش کے متعلق محمد حسین آزاد نے کون سا نظریہ پیش کیا؟

۵۔ دہلی کے آس پاس کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں؟

۶۔ حضرت امیر خسروؒ نے اردو کو کن ناموں سے پکارا ہے؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ اردو زبان کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات پر روشنی ڈالیے۔

۸۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا جائزہ پیش کیجیے۔

ڈاکٹر قائدعلی خاں

دبستانِ دہلی

اردو شعر و ادب میں دبستانِ دہلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دہلی کے شعراء اپنا ایک خاص شاعرانہ مزاج اور طرزِ فکر رکھتے ہیں جس میں اس عہد کی دہلی کی تہذیب وتمدن اقتصادی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کا عکس نظر آتا ہے۔ شہر دہلی لمبے عرصے تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا اور اہل حکومت کی سر پرستی اور شعراء نوازی کے سبب وہاں بڑی تعداد میں شاعر، ادیب اور اہل ہُنر جمع ہو گئے۔ جس کے سبب دہلی نے ایک باقاعدہ ادبی اسکول کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس ادبی اسکول کو 'دبستانِ دہلی' کہا جاتا ہے۔

دہلی میں باقاعدگی کے ساتھ اردو زبان میں شعر و شاعری کا سلسلہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں وؔلی کے دکن سے دہلی آنے کے بعد شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے زمانے تک شمالی ہند میں اردو زبان صرف بول چال کی حد تک محدود تھی اور فارسی زبان کو ہی علمی و ادبی حیثیت حاصل تھی، وؔلی کی آمد کے بعد شعراء نے اردو میں شعر و شاعری کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی۔ ان شعراء میں خان آرزؔو، آبرؔو، شاکر ناجؔی، تاباںؔ، یک رنگؔ، مضمونؔ، شاہ حاتمؔ اور مرزا مظہر جانِ جاناںؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کا زمانہ اردو شاعری کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس زمانے میں فنی اعتبار سے بعض اصناف کی انتہائی ترقی ہوئی جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس نے غزل نہ کہی ہو چنانچہ اس دور میں میرؔ اور دردؔ کی غزلیں اور سوداؔ کے قصیدے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غزل اور قصیدے کے ساتھ ہی میرؔ نے مثنوی کے صنف پر بھی طبع آزمائی کی، سوداؔ نے اردو مرثیے کو نیا قالب اور فکر و انداز عطا کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی تباہ و برباد ہو رہی تھی چاروں طرف انتشار اور افراتفری کا زمانہ تھا، سماجی، معاشی اور معاشرتی بدحالی کا دور دورہ تھا، یہ وہ ناسازگار حالات تھے جس کے سبب دہلی کے نامور شعرا ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ میر تقی میرؔ، سوداؔ، سوزؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ وغیرہ نے دہلی کو خیر باد کہا اور لکھنؤ پہنچے۔ جہاں انہیں شاہان لکھنؤ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔

بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں ایک بار پھر دبستانِ دہلی پر بہار آئی، بہادر شاہ ظفرؔ کو شعر و سخن سے ذاتی دلچسپی تھی، انہوں نے پہلے شاہ نصیرؔ سے اصلاح لی بعد میں ذوقؔ کو اپنا استاد بنایا، بہادر شاہ ظفرؔ نے ذوقؔ کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ اس عہد کے شعرا میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس دور کے سب سے نمایاں شاعر مرزا غالبؔ ہیں۔ انہوں نے غزل، قصیدے، مثنویاں، قطعات اور مرثیے بھی کہے ہیں لیکن غالبؔ کو عظمت غزل گو شاعر کی حیثیت سے ملی۔ ذوقؔ نے اپنا زورِ تخیل قصیدے میں دکھایا اور مومنؔ کی شخصیت غزل میں انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔

دہلی کے شعرا اپنے دلی جذبات واحساسات کی ترجمانی بڑے سیدھے سادے اور دل نشیں انداز میں کرتے ہیں، ان کا کلام تصنع و بناوٹ سے پاک ہے۔ شاعری میں داخلیت ہے جو دہلوی اسکول کی نمایاں خوبی ہے۔ غزل میں حسن وعشق کے موضوعات کثرت سے استعمال کیے لیکن ان میں پاک خیالات اور روحانیت پائی جاتی ہے۔

اخلاق وتصوف کے مضامین بھی دہلی کے شعرا نے خوب قلم بند کیے ہیں چونکہ دہلی صوفیا کا مرکز رہی ہے بعض شاعر خود بھی صوفی تھے جیسے خواجہ میر دردؔ لیکن جو شاعر صوفی نہیں تھے انہوں نے بھی اپنی شاعری میں صوفیانہ خیالات کو پیش کیا۔ اس کا سبب دہلی کے وہ حالات تھے جس نے شعرا کے مزاج میں دنیا کی ناپائیداری اور خوفِ خدا کے جذبات واحساسات پیدا کر دیے تھے۔ طبیعت میں صبر وقناعت اور استغنٰی ہونے کی وجہ سے دہلوی شعرا کے کلام میں حق گوئی اور حق پسندی کے جذبات ملتے ہیں اور سوز و

گداز غزل کی جان ہے۔ دہلوی شعرا کا طرز بیان سادہ اور فطری ہے۔ جدید معنی خیز تراکیب، لطیف استعارے اور نادر تشبیہات کا استعمال بھی ملتا ہے، روز مرّہ اور محاورہ کی چاشنی ہے، کلام میں درد واثر پایا جاتا ہے۔

دبستانِ دہلی کو اس کی شاعرانہ عظمت اور خصوصیات کے بنا پر دبستانِ لکھنؤ پر فوقیت حاصل ہے۔ یہاں کے شعرا نے اپنے کمالاتِ فن کا مظاہرہ اس انداز میں کیا ہے کہ اردو شاعری کو دنیائے شعر وسخن میں ایک الگ پہچان ملی۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ دبستانِ دہلی کے کسی ایک ممتاز شاعر کا نام لکھیے۔

۲۔ سودؔا کو کس صنف میں امتیاز حاصل ہے؟

۳۔ بہادر شاہ ظفرؔ نے کس کو اپنا استاد بنایا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ بہادر شاہ ظفرؔ نے ذوقؔ کو کس خطاب سے نوازا تھا؟

۵۔ مرزا غالبؔ نے کون کون سی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی؟

۶۔ دبستانِ دہلی کے وہ کون سے شعرا تھے جنہوں نے دہلی کو خیر باد کہا؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ دبستانِ دہلی کی شاعرانہ خصوصیات واضح کیجیے۔

۸۔ دہلی کے حالات نے اردو شعراء کو کس طرح متاثر کیا وضاحت کیجیے۔

ڈاکٹر قائدعلی خاں

دبستانِ لکھنؤ

لکھنوی شاعری اپنے عہد کی ملکی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی عکاسی کرتی ہے، جب دلی کی بساط پلٹی تو وہ مغل بادشاہ شاہ عالم کا زمانہ تھا، چاروں طرف انتشار اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سماجی، معاشی اور معاشرتی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ یہ وہ ناسازگار حالات تھے جس کے سبب دہلی کے نامور شعراء ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ ادھر لکھنؤ میں دولت کی فراوانی، عیش وعشرت اور امن وامان تھا۔ بادشاہِ وقت خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدر دان بھی تھے۔ ان کے دربار علم وفن اور شعروسخن کے مرکز تھے چنانچہ نواب شجاع الدولہ سے نواب واجد علی شاہ کے زمانے تک لکھنؤ میں شعروسخن کا اس طرح فروغ ہوا کہ دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کی ایک انفرادیت نظر آنے لگی جس کو دبستانِ لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دہلی کے وہ شعرأ جو دہلی سے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے ان میں میر ضاحکؔ، میر سوزؔ، سوداؔ، میر حسنؔ وغیرہ تھے جو شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے۔ میر تقی میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے صرف دردؔ ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے دہلی کو خیرباد نہیں کہا۔

لکھنؤ میں شعروشاعری کا سلسلہ ان شعرأ کی بدولت شروع ہوا جن کی شاعری کا آغاز تو دہلی میں ہو چکا تھا اور لکھنؤ پہنچ کر انھیں عروج حاصل ہوا۔ بزرگ دہلوی شعرأ نے اپنی روایات کو قائم رکھا لیکن نوجوان شعرأ کے کلام میں نئی فکر، نئے اسالیب، نیا لب ولہجہ، نئے محاورے، نئی بندشیں اور ترکیبیں سامنے آئیں۔ یہ سب وہاں کے تمدن اور خوشحالی کے زیرِ اثر منظرِ عام پر آئیں۔ یہیں سے دبستانِ لکھنؤ کا آغاز ہوا۔

دبستانِ لکھنؤ کا باقاعدہ آغاز انشاؔ، مصحفیؔ کے زمانے سے ہوتا ہے لیکن ان کے یہاں دہلوی

اثرات اتنے غالب رہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری کو خالص لکھنوی رنگِ سخن کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا، البتہ مشکل زمینوں کا استعمال، معاملہ بندی کے اشعار اور ریختی کا اثر ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ اور آتش کے دور میں لکھنوی رنگِ سخن انتہائی عروج پر پہنچا۔ امام بخش ناسخ دبستانِ لکھنؤ کے سب سے نمائندہ شاعر ہیں۔ آپ نے زبان کی اصلاح کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ شاعری کے نئے اصول وضوابط مقرر کئے۔ ناسخ کے شاگردوں میں علی اوسط رشک، بحر، وزیر، منیر، برق وغیرہ شامل ہیں۔ آتش، مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کی غزلوں میں بندشِ الفاظ، اور مرصع سازی کا ہنر نظر آتا ہے۔ آتش کے شاگردوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم، رند، صبا، شوق وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ کی عیش و عشرت کی زندگی، بے فکری اور دولت کی فروانی نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ لکھنوی شعرأ کے کلام میں سطحی مضامین، معاملہ بندی، محبوب کے زلف و رخ، خدوخال اور کنگھی چوٹی کا ذکر ہونے لگا۔ مبالغہ آرائی اور خارجی مضامین پر زور دیا گیا۔ نسوانیت کا غلبہ رہا۔ ریختی کی ایجاد ہوئی۔ تصنع بناوٹ اور خارجیت کا دور دورہ رہا۔

دوسری طرف شعرائے لکھنؤ نے زبان و بیان کو سنوارا، ثقیل الفاظ کو زبان سے خارج کیا۔ شیریں اور لطیف الفاظ کا استعمال کیا۔ اس کے علاوہ شعری صنعتوں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے تخیل کی بلند پروازی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، الفاظ و معنی کی باریکیاں بخوبی ملتی ہیں۔

لکھنؤ میں غزل، مثنوی اور مرثیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ غزل میں ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیے کی ترقی نے اخلاقی مضامین کو جگہ دی۔ زبان کو نئی جلا ملی۔ انیس و دبیر نے اس صنفِ مرثیہ کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ مثنوی نگاری میں میر حسن اور دیا شنکر نسیم نے خوب نام کمایا۔ انھوں نے 'سحر البیان' اور 'گلزارِ نسیم' لکھ کر لکھنوی تہذیب و معاشرت، رسوم و عقائد اور زبان و بیان کے بہترین نمونے پیش کئے۔ یہ دونوں اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ جب دہلی کی بساط پلٹی تو اس وقت کس بادشاہ کا زمانہ تھا؟

۲۔ واجد علی شاہ کہاں کے نواب تھے؟

۳۔ ناسخؔ کا پورا نام کیا ہے؟

مختصر سوالات:

۴۔ دبستانِ لکھنؤ کا باقاعدہ آغاز کن شعرأ کے زمانے سے ہوتا ہے؟

۵۔ لکھنؤ میں اصلاحِ زبان کے لیے کن شعرأ کے نام آتے ہیں؟

۶۔ ناسخؔ کے دو شاگردوں کے نام بتائیے۔

تفصیلی سوالات:

۷۔ دبستان لکھنؤ کی شعری خدمات پر تبصرہ کیجیے۔

۸۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

ڈاکٹر قائدعلی خاں

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

اردو کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج نے بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں قائم کیا۔ڈاکٹر جان گلکرسٹ کواس کالج کا صدر بنایا گیا۔اس کالج کے قیام کا اصل مقصد نو وارد انگریزوں کو ہندوستانی زبان (اردو) سے واقف کرانا تھا۔اس وقت ہندوستان کے اکثر و بیشتر حصّوں میں جو زبان بولی جارہی تھی وہ اردوزبان تھی۔علمی وادبی زبان فارسی تھی۔ادبی ذخیرہ یا تو مذہبی رسائل تھے یا مشکل زبان میں لکھی گئی کتابیں تھیں۔جان گلکرسٹ نے تمام ہندوستان سے قابل ماہرینِ زبان کو جمع کیا اوران سے تصنیف وتالیف کا کام کروایا گیا۔فارسی سے اردو میں تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔سادہ اور سلیس زبان پر زور دیا گیا۔کچھ ہی عرصہ میں اردو میں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے نامور ادیبوں میں میر امّن ،حیدر بخش حیدری ،شیر علی افسوؔس ،مرزا علی لطفؔ ،بہادر علی حسینی ،مظہر علی ولاؔ ،مرزا کاظم علی جواںؔ ،نہال چند لاہوری شامل ہیں ،جن کی علمی وادبی کاوشوں نے فورٹ ولیم کالج کا نام تاریخ میں درج کروایا۔

جان گلکرسٹ:

۱۸۰۰ء میں گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے۔وہ اردو زبان کے بڑے حمایتی اور خیر خواہ تھے،اس ادارے میں جب با قاعدہ اردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے ملک کے کئی قابل لوگوں کو مدرس مقرر کیا،ساتھ ہی تصنیف وتالیف کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا،ان

کتابوں کو چھاپنے کے لیے اردو ٹائپ کا ایک مطبع بھی قائم کیا، انہوں نے خود بھی بعض کتابیں تصنیف کیں، جیسے ہندوستانی انگریزی لغت، ہندوستانی علم اللسان، اردو صرف ونحو، رہنمائے زبانِ اردو، قصصِ مشرقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میر امّن:

میر امن دہلی کے رہنے والے تھے، ان کی ادبی زندگی کا آغاز کلکتہ پہنچ کر فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کے بعد شروع ہوا، اپنے دوست بہادر علی حسینی کے توسط سے کالج میں ملازمت حاصل کی، فارسی کتابوں کے آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ کا کام کیا۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' لکھی جو فارسی 'قصۂ چہار درویش' کا اردو ترجمہ ہے، یہ کتاب اپنی سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئی۔ باغ و بہار کو نہ صرف اردو میں مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ ان کی دوسری تصنیف 'گنج خوبی' ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی 'اخلاقِ محسنی' کا ترجمہ ہے۔

حیدر بخش حیدری:

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ادیبوں میں آپکا شمار ہوتا ہے۔ آپ دہلی کے رہنے والے تھے پہلے بنارس پھر کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ اس کالج کے مصنفین میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ حیدری کی تصنیفات میں 'قصہ مہر و ماہ'، 'قصۂ لیلیٰ مجنوں'، 'طوطا کہانی'، 'آرائشِ محفل'، 'ہفت پیکر'، 'تاریخِ نادری'، 'گلِ مغفرت'، 'گلزارِ دانش'، 'گلشنِ ہند' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے فارسی قصہ 'حاتم طائی' کا ترجمہ 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا۔ ان کی دوسری کتاب 'طوطا کہانی' ہے جو سید محمد قادری کے فارسی 'طوطی نامہ' کا ترجمہ ہے۔ اس میں سلیس اور سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ 'آرائشِ محفل' اور 'طوطا کہانی' زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

میر شیر علی افسوسؔ :

شیر علی افسوسؔ کا شمار فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں ہوتا ہے افسوسؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، انشاؔ مصحفیؔ اور جرأتؔ کا زمانہ تھا۔ آپ کو ان کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا، منشی کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کی گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی کی دو کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا 'باغِ اردو' اور 'آرائش محفل'۔ 'باغِ اردو' شیخ سعدیؔ کی 'گلستاں' کا اردو ترجمہ ہے اور 'آرائشِ محفل' منشی سجان رائے کی فارسی تاریخ 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ ہے افسوسؔ نہ صرف ادیب بلکہ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔

مرزا علی لطفؔ :

مرزا علی لطفؔ کا فورٹ ولیم کالج کے اہلِ قلم میں شمار ہوتا ہے گلکرسٹ کی فرمائش پر اردو شاعروں کا ایک تذکرہ 'گلشن ہند' لکھا جو فارسی تذکرہ 'گلزار ابراہیم' کا اردو ترجمہ ہے تذکرہ میں صرف شعرا کے حالات ہی نہیں اس دور کا پورا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

بہادر علی حسینی :

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے والے ادیبوں میں سب سے پہلا نام بہادر علی حسینی کا ہے، انھوں نے 'نثرِ بے نظیر' اور 'اخلاقِ ہندی' لکھیں۔ حسینی نے میر حسنؔ کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' کو نثر میں لکھا اور اس کا نام 'نثرِ بے نظیر' رکھا۔ 'اخلاقِ ہندی' فارسی سے ترجمہ ہوئی اس کے قصے سنسکرت کی اخلاقی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

مظہر علی خاں ولاؔ :

فورٹ ولیم کالج میں منشی کے عہدے پر فائز ہوئے، دہلی کے رہنے والے تھے، کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا، ہندی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ انھوں نے حسب ذیل سات

کتابیں لکھیں 'مادھونل کام کندلا'، 'ترجمہ کریمہ'، 'ہفتِ گلشن'، 'اخلاقِ ہندی'، 'بیتال پچیسی'، 'تاریخِ شیر شاہی' اور 'جہانگیر نامہ'۔

مرزا کاظم علی جواںؔ :

جواںؔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے، دہلی کے رہنے والے تھے، دہلی تباہ ہوئی تو لکھنؤ کا رخ کیا، لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کی سفارش سے کلکتہ پہنچے، وہاں انھوں نے 'شکنتلا ناٹک'، 'بارہ ماسہ' اور 'تاریخِ فرشتہ' مرتب کیں۔ آپ نے گلکرسٹ کی فرمائش پر کالی داس کی 'ابھگیان شکنتلم' کا ترجمہ 'شکنتلا ناٹک' کے نام سے کیا جو بہت مشہور رہا۔

نہال چند لاہوری :

نہال چند لاہوری کا فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر 'گلِ بکاؤلی' کے فارسی قصے کو آپ نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام 'مذہبِ عشق' رکھا اس کی شہرت و مقبولیت کو دیکھ کر پنڈت دیا شنکر نسیمؔ نے اسے 'گلزارِ نسیم' کے نام سے نظم کیا۔

فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں کی کوششوں سے تصنیف و تالیف اور تراجم کا جو سلسلہ شروع ہوا اس سے اردو نثر کو کافی فروغ حاصل ہوا اور ساتھ ہی مشکل پسندی اور مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی کی جگہ سادہ سلیس زبان پر زور دیا جانے لگا۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ فورٹ ولیم کالج کس سن میں قائم ہوا؟

۲۔ میر امّن کہاں کے رہنے والے تھے؟

۳۔ 'باغ و بہار' کے مصنف کون ہیں؟

مختصر سوالات:

۴۔ حیدر بخش حیدری کی چند تصانیف کے نام لکھیے۔

۵۔ جان گلکرسٹ کون تھے؟ ان کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیے۔

۶۔ 'مذہبِ عشق' کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

۸۔ فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی علمی کوششوں پر روشنی ڈالیے۔

ڈاکٹر فیروز بیگ

علی گڑھ تحریک

سرسید تحریک ایک علمی وادبی تحریک تھی جس کے بانی سرسید احمد خاں تھے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال ہو رہا تھا، انگریزی حکومت غالب آ رہی تھی اور ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔یہیں سے مسلمانوں کی بربادی کا سلسلہ شروع ہوا۔دراصل اس کی ذمہ دار اس قوم کی پستی، بےعملی، جہالت، ناعاقبت اندیشی تھی جس نے انہیں تباہی کے گڑھے میں ڈال دیا۔ان حالات میں ایک رہنما اور مصلح قوم کی ضرورت محسوس ہوئی جو مسلم قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرے سرسید نے یہ کام کر دکھایا۔ان کے دل میں قوم کا درد تھا، انہوں نے سوتوں کو جھنجھوڑا ان کا کھویا ہوا وقار واپس دلایا، فکر وعمل کی تلقین کی اور اپنی اصلاحی کوششوں سے ان کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔سرسید کی قومی بھلائی کے جذبے نے مذہب، ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت غرض ہندوستانی مسلمانوں کے سبھی مسائل پر توجہ کی۔آخر سرسید کی محنت رنگ لائی، مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی اور قوم ترقی کے راستے پر گامزن ہوئی۔سرسید کی ان کوششوں کو سرسید تحریک کہا گیا چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سرسید نے جدید تعلیم کو مسلمانوں کی ترقی کا واحد ذریعہ بتایا، انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم کا ذوق پیدا کیا۔وہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی، انگلستان کا سفر کیا وہاں کیمبرج اور آکسفورڈ یونی ورسیٹیوں کے تعلیمی نظام کا بغور جائزہ لیا۔وہاں سے لوٹ کر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔اے۔او۔کالج) کی بنیاد ڈالی۔۱۹۲۰ء میں اس کالج نے یونی ورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا۔اب اسے علی گڑھ یونیورسٹی کے نام سے جانا

جاتا ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد مغربی علوم کی مختلف کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانا تھا تاکہ جدید علوم سے مسلمان واقفیت حاصل کریں۔ اس کے علاوہ 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا گیا۔

سرسید چاہتے تھے کہ ملک کے ہر شہر اور قصبے میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسے قائم کیے جائیں۔ اسی مقصد کے تحت سرسید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، بعد میں اس ادارے کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہوا۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لہٰذا 'تاریخ سرکشیِ بجنور' (۱۸۵۸ء) میں اس کی تفصیل موجود ہے اور ۱۸۵۹ء میں 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھ کر انھوں نے یہ واضح کیا کہ سرکار کی غلط پالیسی ہی اس کی ذمہ دار تھی۔ بعد میں ۱۸۶۰ء میں 'لائل محمڈنز آف انڈیا' میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان انگریزی سرکار کے بدخواہ نہیں۔ ایک انگریز ولیم میور نے 'لائف آف محمدؐ' لکھی جس میں سیرت پاکؐ پر غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا جس کی تردید میں انھوں نے 'خطبات احمدیہ' لکھی۔

انگلینڈ کے دورانِ سفر انھوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالے 'ٹیٹلر' اور 'اسپیکٹیٹر' کا مطالعہ کیا۔ جو انھوں نے معاشرے کی اصلاح کی غرض سے لکھے تھے۔ ہندوستان واپس آکر سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ اس رسالے میں علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے گئے۔ سرسید کے تعلیمی و اصلاحی مشن میں ان کے رفقا خواجہ الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی ذکا اللہ کے نام شامل ہیں۔ جنھوں نے سرسید کے ساتھ قدم سے قدم ملایا اور اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو نئے انداز میں پیش

کیا۔ان لوگوں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں مضامین ہی نہیں لکھے بلکہ بیش قیمتی تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔

محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ حالیؔ نے سرسید کی فرمائش پر 'مسدس مدو جزر اسلام' لکھی۔اس کے علاوہ حالیؔ نے 'مقدمہ شعر وشاعری'، 'حیاتِ سعدیؔ'، 'حیاتِ جاوید'، 'یادگارِ غالب' بھی تصنیف کیں۔محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات'، 'نیرنگِ خیال'، 'دربارِ اکبری' وغیرہ تصانیف لکھ کر ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔

شبلیؔ کی تصانیف میں 'شعر العجم'، 'الفاروق'، 'المامون'، 'موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ' وغیرہ یادگار ہیں۔اسی طرح نذیر احمد نے 'مراۃ العروس'، 'بنات النعش'، 'توبتہ النصوح'، 'فسانۂ مبتلا'، 'ایامیٰ' اور 'رویائے صادقہ' لکھ کر ناول کی صنف کو مقبول بنایا۔

غرض سرسید کے مضامین میں ادب، مذہب، سیاست، تعلیم معاشرت، اقتصادیات سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آپ کے رفقاء میں حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ نے اردو نثر، تنقید، تاریخ، سوانح کو بلند مقام پر پہنچایا۔مقالہ نگاری میں محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی وغیرہ بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔

سرسید نے اردو نثر کو لفّاظی، تصنّع، عبارت آرائی سے نجات دلائی اور مدعا نویسی اور استدلالی نثر پر زور دیا، زبان صاف اور سادہ استعمال کی۔سرسید کا کہنا تھا کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

۱۔ سرسید تحریک کے بانی کا نام کیا ہے؟

۲۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام کب عمل میں آیا؟

۳۔ سرسید نے کون سا رسالہ نکالا تھا؟

مختصر سوالات:

۴۔ سرسید کے رفقاء کے نام لکھیے۔

۵۔ سرسید کی چند اہم تصانیف کے نام بتائیے۔

۶۔ 'مسدس مدوجزر اسلام' کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۷۔ علی گڑھ تحریک سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۸۔ سرسید کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔